

کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، ٹھیک اُس لمحے، جب وہ اپنے دل کے فیصلوں پر عمل شروع کر دیتا ہے۔ میری طرح تم نے بھی خود کو اس عورت کی خاطر برباد کر لیا، پُری زاد..... بُرا کیا، بہت بُرا کیا تم نے۔“ بہروز پلٹا اور زور سے چلایا۔ ”اسے لے آؤ فیروز خان.....“ بہروز کی آواز اس ویران تہہ خانے کی پارکنگ میں گونج کر رہ گئی۔ اُس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ لیلیٰ خاص طور پر اس پارکنگ میں گاڑی کیوں لگواتی تھی، کیوں کہ یہ پارکنگ تقریباً متروک ہو چکی تھی اور پارکمنٹ والے اب چھت پر بنی نئی پارکنگ استعمال کرتے تھے۔ لہذا یہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ اس لیے لیلیٰ کی گاڑی گھنٹوں یہاں کھڑی رہتی، تب بھی کسی کے متوجہ ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ مگر آج وہی ویرانی اور تنہائی اس پارکنگ میں ہمارے لیے وبال جان بن گئی تھی۔ بہروز کے چلانے پر کچھ دیر بعد فیروز خان دو محافظوں کی مدد سے ایک خوب صورت اور پینڈم سے نوجوان کو سختی سے جکڑے اور اس کے منہ پر ٹیپ لپیٹے ایک جانب سے برآمد ہوا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا، کیوں کہ آج سے پہلے میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر لیلیٰ کے جسم سے تو جیسے خون کا آخری قطرہ بھی نچر گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں زور سے چلائی ”نہیں آغا نہیں..... اس میں ولید کا کوئی قصور نہیں..... بخش دیں اسے۔“ لیلیٰ دوڑتی ہوئی آئی اور بہروز کے قدموں سے لپٹ گئی۔ بہروز نے کسی اُن دیکھی اذیت کے احساس سے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں اور دھیرے سے یوں بڑبڑایا، جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔ ”کیوں جان آغا..... کیوں..... کس چیز کی کمی تھی تمہیں..... کیا نہیں دیا میں نے تمہیں؟ پیار، محبت، عیش، آرام، دولت، جائیداد، رتبہ، عزت..... آخر کس چیز کی کمی تھی میرے پاس تمہیں؟“ لیلیٰ زار و قطار رو رہی تھی اور وہ اجنبی نوجوان بہروز کے محافظوں کے شکنجے میں تڑپ رہا تھا۔ بہروز نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ”یہ وہی ہے ناں، تمہارا سابقہ منگیتر، استنبول والا، ولید.....“ لیلیٰ تڑپ کر آگے بڑھی۔ ”ہاں آغا! یہ وہی ہے، اسے میری محبت یہاں کھینچ لائی..... یہ سچ ہے کہ آپ نے مجھے سب کچھ دیا۔ پُہ میں اپنی پہلی محبت کبھی بھلا نہیں پائی۔ معاف کر دیں ہم دونوں کو۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ کم از کم اسے جانے دیں۔“ بہروز نے کرب سے اپنی مٹھیاں سمجھتی لیں۔ رقیب کو سامنے زندہ دیکھنے سے زیادہ اذیت ناک، اپنے محبوب کی زبان سے اس کی تعریف سُنتا ہوتا ہے۔ بہروز نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ ”واہ رے عورت! واہ، ساری کائنات کے سربستہ راز ایک جانب اور تیرے من کا گورکھ دھندا ایک طرف۔ تجھے سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔“ بہروز ایک جھٹکے سے فیروز کی طرف مڑا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا ناں فیروز خان! ہمارے پیچھے کچھ چکر چل رہا ہے۔ اب دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے؟“ فیروز خان نے سر جھکا لیا۔ اب مجھے بہروز کی منصوبہ بندی سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے لیلیٰ کی نگرانی پر رکھا تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ لیلیٰ صبا میری نگرانی میں غیر محتاط ہو جائے گی۔ اس کی سال گرہ والے دن جزیرے پر جانے کا پروگرام بھی ساری ڈرامے بازی تھی۔ وہ کبھی شہر سے باہر گیا ہی نہیں تھا۔ اسے بہت پہلے سے لیلیٰ کی بے وفائی کا علم تھا۔ وہ تو بس لیلیٰ کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ سب مُہرے بہروز نے بہت ناپ تول کر پختے تھے۔ ساری بساط ہی بہروز کی اپنی بچھائی ہوئی تھی۔ اور اب بازی بھی اسی کے ہاتھ تھی۔ بہروز نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے فیروز خان کی طرف

دیکھا۔ ”مجھے لیلیٰ صبا بہت پیاری ہے فیروز..... بہت ٹوٹ کر محبت کی ہے میں نے اس سے..... دھیان رہے، اسے مرتے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو اور ولید چوں کہ میری محبوب کا محبوب ہے۔ لہذا اس کی موت بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ آخر یہ بہروز کریم کا رقیب ہے۔ یہ اگر عام لپٹے لٹکے عاشقوں کی طرح مارا گیا، تو یہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ لے جاؤ ان دونوں کو۔“ لیلیٰ زور سے چلائی۔ ”نہیں آغا! نہیں.....“ فیروز نے محافظوں کو اشارہ کیا، انہوں نے لڑکے اور لیلیٰ کو لے جانے کے لیے کھینچا۔ بہروز دھیرے سے بڑبڑایا۔ ”عشق بڑا ظالم ہوتا ہے..... جان کا صدقہ لیے پنا کہاں ملتا ہے۔“ اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں جلدی سے بہروز کی طرف بڑھا۔ ”انہیں معاف کر دیں مالک! ان کا قصور بہت بڑا ہے، مگر آپ رحم کریں۔“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی میرے سر پر کسی محافظ کی خود کار مشین گن کا دستہ پوری قوت کے ساتھ لکرایا اور میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔ گرنے سے پہلے میں نے تہہ خانے کے کسی کونے سے دو فائزر کی آواز سُنی۔ اور ان سے زیادہ بلند لیلیٰ کی کرب ناک چیخ تھی، پھر دھیرے دھیرے میرا وجود گہرے تاریک اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

سائنس دان موت کی ایک تشریح یہ بھی کرتے ہیں کہ جب انسانی دماغ سے نکلنے والی برقی نبض (Electrical impulse) ختم جائے تو اسے روح نکل جانے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور روح نکل جانے کے بعد انسانی جسم کی حالت کو ہم موت کہتے ہیں۔ جانے میری روح کتنے عرصے بعد دوبارہ میرے جسم میں واپس آئی۔ رات کا شاید آخری پہر تھا۔ میں کسی اندھیرے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا، مگر یہاں اتنا اندھیرا کیوں تھا۔ ضرور بہروز نے ان دونوں کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیا تھا۔ اور اب میں کمرے میں نہیں، کسی قبر میں دفنایا جا چکا تھا۔ ٹھیک ہی کیا بہروز نے۔ زندگی کے کسی امتحان میں بھی تو پورا نہیں اُتر پایا تھا میں..... چلو، جو ہوا، اچھا ہوا۔ قصہ تمام ہوا۔ شجر تو تھے ہی نہیں راستے میں کیا کرتے..... خود اپنے سائے میں چل کر سفر تمام کیا۔ مگر میرا سفر ابھی کچھ باقی تھا شاید..... اچانک کمرے میں تیز روشنی ہو گئی اور کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا۔ ”پُری زاد..... ہوش میں آؤ، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گھر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janguroup.com.pk

رومی کہتا ہے کہ ”تمہارا مقصد محبت کی تلاش میں بھٹکنا نہیں..... تمہیں تو بس ان تمام رکاوٹوں کو کھوجنا ہے، جو تم نے خود اپنے اندر اس محبت کے خلاف کھڑی کر رکھی ہیں۔“ میں بھی شاید اپنے اندر کی رکاوٹیں کھوج لیتا، اگر مجھے مزید کچھ دیر اس بے ہوشی کے سمندر میں غرق رہنے کا موقع مل پاتا، مگر کوئی مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ”پری زاد، ہوش میں آؤ..... ہم یہاں سے کوچ کر رہے ہیں.....“ میری چندھیائی آنکھوں نے فیروز خان کا دھندلا سا ہولا دیکھا، جو مجھ پر ٹھکا مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، چند لمحوں کی غنودگی کے بعد میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے کے بستر پر تھا۔ فیروز نے میرا چہرہ تھپتھپایا۔ ”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم سب کچھ دن کے لیے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے۔ ہم لوگ باہر گاڑیوں کے قریب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دوپہر کی تیز دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مطلب میں پورا دن بے سندھ پڑا رہا تھا۔ میرے سر میں ابھی تک درد سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو بٹی بندھی ہوئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہی مجھے ایک زوردار چکر آیا اور میں نے جلدی سے پٹنگ کی پائنتی کو پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک سُرخ اور سیاہ دائرے آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے اور پھر میں اپنے ڈولتے قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا باہر نکل آیا۔ پورچ میں تقریباً سبھی گاڑیاں روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ سارا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یہ عمارتیں مکینوں کے پناکتی ویران ہو جاتی ہیں۔ شاید انسان دنیا کا سب سے بڑا ساحر، جادوگر ہے، لوگوں کو تو اپنا عادی بناتا ہی ہے۔ گھر، دیواریں اور مکان بھی اس کے سحر سے بچ نہیں پاتے۔ میرے گاڑی میں بیٹھے ہی فیروز نے گاڑی آگے بڑھادی اور باقی ساری گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے چل پڑیں۔

”مالک کہاں ہیں.....؟“ فیروز میرا سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہا۔ ”وہ وہیں گھر پر رہیں گے تین دن۔ مالکن کے سوئم کے بعد ہم بھی واپس چلے جائیں گے گھر.....“ میرے اندر کوئی دل نما چیز بہت زور سے ٹوٹی۔ بڑے زور کا چھٹکا ہوا۔ ایک ہلکی سی آس، جو میرے سینے میں کسی پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی، فیروز نے ایک جھٹکے ہی میں اسے کھینچ کر باہر نکال دیا۔ کچھ تیر، جن کے دھوم ہے سرے آگے کی جانب سے باہر کومڑے ہوتے ہیں، ان کا جسم میں پیوست ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا، جتنی اذیت ان کو جسم سے باہر کھینچ نکالنے میں ہوتی ہے۔ جانے میں کیوں یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ بہروز کریم نے لیلیٰ کو معاف کر دیا ہوگا۔ مگر افسوس ہماری آس اور امیدیں اکثر غدا دے جاتی ہیں۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ رات کو قمر بنی پولیس اسٹیشن میں بہروز کے ڈرائیور نے رپورٹ درج کروائی کہ جیسے ہی اس کی مالکن لفٹ سے باہر نکلی، ایک نوجوان نے اس پر حملہ کر دیا اور نوجوان کے پستول سے نکلی گولی مالکن کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ ڈرائیور کی جوابی گولی سے نوجوان بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیلیٰ کے سینے میں پیوست گولی، جس پستول سے نکلی تھی، وہ پنا لائسنس تھا اور نوجوان کے ہاتھ میں دبا پایا گیا تھا۔ ڈرائیور کا ہسپتال لائسنس والا تھا، جو اس نے رپورٹ کے ساتھ ہی تھانے میں جمع کروادیا۔ اور اس وقت ڈرائیور پولیس کی حراست میں تھا۔ بہروز نے ہم سب کو احتیاطاً محل سے منتقل کروادیا تھا، تاکہ ہم میں سے کوئی پولیس کی نظروں میں نہ آ سکے۔ پولیس اس بات کی تفتیش میں لگی تھی کہ آخر مرنے والے اس نوجوان کا مقصد کیا تھا۔ بہروز نے پولیس کے سامنے شک ظاہر کیا تھا کہ مرنے والے ولید کا تعلق اس کے مخالف کاروباری طبقے سے ہو سکتا ہے۔ بہر حال، جو کچھ بھی تھا۔ یہ تفتیش اب لمبی چلنے والی تھی، مگر میں ان سب باتوں سے لاتعلقی اپنے آپ میں گم بیٹھا صرف لیلیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیلیٰ صبا نے ایسا کیوں کیا۔ یہ محبت تو انسان کو جان لیوا حد تک نڈر بنادیتی ہے، آخر کس چیز کی کمی تھی لیلیٰ کو۔ حُسن، صورت، شکل، دولت، مرتبہ اور عزت..... کیا محبت ان سب نعمتوں سے الگ، کچھ سوا مانگتی ہے؟ شاید محبت کی ضروریات اور محبت کی دنیا ہماری ان سب عارضی خواہشات اور دکھاوے کی دنیاؤں سے بہت بلند، بہت جدا ہوتی ہے۔ ہم ایک ہفتے تک کسی اور کوششی میں منتقل بلکہ مقید رہے۔ پابندی اور اکتاہٹ گزرتے وقت کو بہت طویل بنا دیتی ہے، مگر جیسے تیسے وہ ایک طویل ترین ہفتہ بھی گزر رہی گیا۔

آٹھویں دن ہم پھر سے بہروز کے محل میں تھے، مگر بہروز اب وہ بہروز نہیں تھا، جسے میں نے آٹھ دن پہلے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں کی ویرانی اور وحشت دیکھ کر میں اندر سے لرز سا گیا، وہ پُپ چاپ سا اپنی خواب گاہ کی بالکونی (ٹیرس) میں بیٹھا ڈور خلا میں گھور رہا تھا۔ ”آگئے تم لوگ..... اچھا کیا، مگر اب کچھ دن تک ذرا محتاط رہنا، معاملہ تازہ ہے.....“ فیروز سر ہلا کر باقی ساتھیوں سمیت پلٹ گیا، مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور تنہائی پاتے ہی ان سے براہ راست پوچھ لیا۔ ”آپ نے انہیں مار کیوں دیا، آپ تو ان سے بہت محبت کرتے تھے، پھر.....؟“ بہروز اب بھی گم صم تھا ”محبت کرتا تھا، تب ہی تو مار ڈالا.....“ میری آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہو گئی۔ ”مگر کیوں؟ آپ انہیں طلاق دے کر فارغ بھی تو کر سکتے تھے۔ جان بخشی بھی تو ممکن تھی ان کی۔ آپ کے ساتھ نہ سہی، مگر کم از کم وہ زندہ تو رہتیں۔“ بہروز نے میری طرف دیکھا۔ میری نظر جھک گئی۔ ”اتنا ظریف نہیں تھا مجھ میں پری زاد..... کبھی کبھی محبت ہمیں بہت خود غرض، بڑا کم ظرف بنادیتی ہے۔ یہ جو لوگ محبت میں قربانی، ایثار اور بانٹ دینے کے فلسفے کی باتیں کرتے ہیں، یہ سب بکواس ہے، جھوٹ بولتے ہیں سب۔ محبت، شدید نفرت سے بھی زیادہ کمینہ اور خود غرض جذبہ ہے اور جن کی محبت میں لالچ، خود غرضی اور سب کچھ پالینے کی ہوس نہیں ہوتی، سمجھ لو، ان کی محبت میں ہی زرا کھوٹ ہے۔“ بہروز نے آج پہلی بار مجھ سے یوں کھل کر بات کی تھی یا پھر شاید آج اُسے دل کی بات سننے کے لیے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ ہم زندگی میں اپنے دل کی بہت سی باتیں اس لیے نہیں کرتے، کیوں کہ ہمیں اپنے معیار کا سامع نہیں ملتا۔ میری آواز ٹوٹ

ٹوٹ کر نکل رہی تھی۔ ”تو پھر مجھے کیوں بخش دیا آپ نے۔ میرا جرم بھی تو کچھ کم نہیں تھا۔ مجھے بھی وہیں مار ڈالتے۔“ بہروز اب بھی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ”ہاں، تمہیں بھی مار دیتا اسی وقت۔ بس تمہاری آخری خواہش نے ہاتھ روک دیا میرا۔ کیوں خود سے اتنی نفرت کرتے ہو؟ مرد کی شخصیت صرف اس کے چہرے سے مکمل نہیں ہوتی۔ یہ سب لوڑنڈل کلاس طبقے کی محرومیاں ہیں۔ مرد دولت، اختیار، طاقت اور رتبے سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ چہرہ، وجاہت وغیرہ فلمی ستاروں کی ضرورت ہے۔ سپنوں کے شہزادے صرف ناؤز میں پائے جاتے ہیں۔ اصل دنیا تمہارے چہرے سے کہیں زیادہ کرخت ہے پری زاد۔“ میں چُپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ یہ بات کبھی مجھے لہنی کی ماں نے بھی کہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی بہروز کو کچھ یاد آ گیا۔ ”ہاں، مگر تمہیں خود گُشی کا اتنا شوق کیوں ہے۔ تم جانتے تھے کہ وہ عورت تمہاری جان کے ذرپے ہے اور سارے الزام تمہارے سر ڈال کر اپنی آئی قضا، تمہارے حصے منتقل کرنا چاہتی ہے، پھر بھی تم نے اس کے لیے جھوٹ بولا، کیوں.....؟“ ”اس لیے کہ میں آپ کے نوکروں اور دیگر عملے کے سامنے آپ کے گھر کی عزت کو رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لیلیٰ مالکن نے ہمیشہ یہی بتایا کہ وہ اپنی سہیلی یارشتے داروں سے ملنے جاتی ہیں، اپنی تنہائی سے گھبرا کر۔ ورنہ میں کبھی آپ سے نہ ٹھپاتا۔“ بہروز نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں جانتا ہوں، اس کے لیے تمہیں بے وقوف بنانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بہر حال، تم نے اپنی زندگی کے بدلے میری عزت بچانے کا سوچا۔ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہاری ذمے داریاں آج سے بدل دی گئی ہیں۔ جاتے ہوئے فیروز سے ملتے جانا اور ہاں اب تم انیکسی ہی میں رہو گے۔“ بہروز کے کمرے سے نکل کر میں انیکسی میں واپس آ گیا۔

اگلے روز فیروز نے مجھے ایک آراستہ دفتر میں پہنچا دیا۔ ”یہ آج سے تمہارا دفتر ہے، مالک نے تمہیں منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی ہے۔ باہر بیٹھا عملہ تمہیں سارا کام سمجھا دے گا۔ یہ ہماری سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا دفتر ہے اور یہ سارا عملہ آج سے تمہارے ماتحت ہوگا۔“ میں حیرت سے فیروز کو دیکھتا رہا۔ فیروز نے میرے چہرے پر لکھے سوال پڑھ لیے اور مسکرا کر بولا ”تم بہت جذباتی ہو۔ مگر وفادار ہو۔ اور مالک وفاداروں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ تمہیں اب کچھ عرصے تک اسی کمپنی کا کام دیکھنا ہوگا، کیوں کہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہاری جذباتیت کسی بھی موڑ پر ہمارے لیے کوئی نیا بکھیڑا نہ کھڑا کر دے، لہذا فی الحال تمہیں کسی خطرے والے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ ویسے بھی دعویٰ کی پولیس اب چوبیس گھنٹے ہم سب پر نظر رکھ رہی ہے۔ یہاں کا قانون سب کے لیے یکساں اور بہت سخت ہے، تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔“ فیروز اپنی بات ختم کر کے چلا گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا اس عالی شان دفتر اور بڑی سی میز کے پیچھے رکھی اس چمکتی سیاہ کرسی کو دیکھتا رہا۔ کل کی ایک غریب بستی کا پری زاد آج دعویٰ کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا منیجر تھا۔ میں نے کرسی کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بیٹھ کر تین چار مرتبہ اسے گھما کر بارہویں منزل پر واقع اپنے دفتر کی بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیوں سے دعویٰ شہر کی گہما گہمی کا نظارہ کیا۔ اُس روز مجھ پر ایک اور صدیوں پرانا راز بھی منکشف ہوا کہ ان اونچی آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کے کمروں میں بیٹھے لوگوں کو زمین پر چلتے عام انسان اتنے چھوٹے، حقیر اور کیڑے مکوڑوں جیسے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرے دن رفیق اچانک ہی ہنا ہٹائے کسی کام سے دعویٰ آ گیا، اور عملے سے پوچھتے پاچھتے فیکٹری کے دفتر تک آ پہنچا۔ مجھے منیجر کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو وہ کچھ کہنا ہی بھول گیا۔ میں نے چہرہ اسی سے چائے یا کافی لانے کے لیے کہا اور رفیق کو ہاتھ سے پکڑ کر سامنے صوفے پر بٹھا دیا۔ ”اب کچھ کہو گے بھی یا یوں ہی گم صم بیٹھے رہو گے؟“ رفیق نے ایک ہی سانس میں پانی کا پورا گلاس حلق سے نیچے انڈیل لیا۔ ”پری زاد پیارے..... سچ بتاؤ، تم کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہے، جو تم مجھے اور باقی دنیا کو بتائیں سکتے۔“ میں نے گہری سانس بھری ”نہیں، میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا، جس کے بارے میں مجھے تم سے یا کسی اور سے کچھ ٹھپانے کی ضرورت پیش آئے۔“ مگر میرے جواب سے رفیق کی تنقید نہیں ہوئی۔ ”دیکھو پری زاد! میں جانتا ہوں کہ بہروز مالک کے ہاں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے، جس کی ہمیں بھی خبر نہیں۔ اگر خود کو کسی ایسی گروہ میں الجھا بیٹھے ہو، تو ابھی بھی وقت ہے، میں تمہیں چپ چاپ دعویٰ سے پار کروا سکتا ہوں، ایک دو دوست ہیں میرے لالچ والے۔ کسی کو تمہارے فرار کی خبر بھی نہیں ہوگی۔“ میں نے مسکرا کر اپنے اس نادان دوست کی طرف دیکھا۔ ”مجھے صرف خود اپنے آپ سے فرار چاہیے۔ بولو، خود مجھے اپنے آپ سے فرار کروا سکتے ہو.....؟ ہے کوئی ایسی لالچ، بحری جہاز یا اڑن کھولا، جو مجھے خود میری ذات کے جزیرے سے فرار کروانے میں مدد کر سکے.....؟“ رفیق کی پٹلیں نم ہو گئیں اور پھر وہ زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہیں سکا۔

میرے دن اور رات پھر سے اسی یکسانیت کا شکار ہونے لگے، جس سے میں ہمیشہ ہی بے زار رہتا تھا، البتہ پیانو سے دوستی پکی ہو چکی تھی۔ لیلیٰ کی موت کے بعد مارٹھا نے محل میں آنا بند کر دیا تھا، مگر اب میری انگلیاں اپنی مرضی کی دُھنیں بکھیرنا خوب جانتی تھیں۔ بہروز کریم بھی اب زیادہ تر گھر ہی پر رہتا تھا، خاموش، کھو یا کھویا، افسردہ سا..... اُس شام میں ایک ضروری فائل پر اس کے دستخط لینے اس کے پاس پہنچا، تو وہ کہیں جانے کی تیاری میں دکھائی دیا۔ ”آپ کہیں جا رہے ہیں مالک؟“ ”ہاں، کچھ دن کے لیے اس کی یادوں سے فرار کی ایک کوشش کر دیکھتا ہوں، حالاں کہ کہیں نہ کہیں اندر سے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بے کار جائے گا۔“ بہروز شام کے جہاز سے لندن فلائی کر گیا اور میں رات گئے تک یہ سوچتا رہا کہ ہم انسان سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ رشتے ناتے دوستیاں، دشمنیاں، مذہب اور حتیٰ کہ اپنے خدا کو بھی، تو پھر صرف ایک محبت کی یاد کو اپنے دل سے مٹا کیوں نہیں پاتے۔ کاش یہ مقدر انسان کو اور کوئی اختیار نہ دیتا، صرف یادیں بھلانے کا مختار کر دیتا۔

میری توقع کے مطابق بہروز زیادہ دن باہر نہیں پتا سکا اور ٹھیک دو ہفتے کے بعد واپس آ گیا۔ مگر اس کی واپسی کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا، جب فیروز نے مجھے خبر دی کہ اس ٹُرک نوجوان، ولید کا باپ انتہائی اثر و رسوخ والا ہے اور وہ بہت جلد دعویٰ پہنچ کر لیلیٰ صبا اور اپنے بیٹے کے قتل کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش شروع کروانا چاہتا ہے اور پھر ٹھیک تین دن بعد پولیس کی بہت سی گاڑیاں بہروز کریم کے گھر کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئیں اور ایک بار پھر ہم سب سے بیانات لیے گئے۔ بہروز کے چہرے پر حسب معمول کوئی تاثر نہیں تھا، مگر فیروز مجھے کافی پریشان دکھائی دیا۔ رات کو بہروز نے ہم سب کو محل کے بڑے ہال میں میٹنگ کے

لیے بلایا اور پُر سکون لہجے میں بتایا کہ دعویٰ پولیس نے کیس پھر سے کھول لیا ہے، اور ڈرائیور جس کی ضمانت ہو چکی تھی، اسے بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے، لہذا اس کے ذاتی عملے کو آج کے بعد گھلی اجازت ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے جو جہاں نکلنا چاہے، نکل جائے، اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے دن بہت سخت ہوں، کیوں کہ دعویٰ پولیس بہت عرصے سے اس موقع کی تلاش میں تھی کہ انہیں بہروز کے خلاف کوئی شکایت موصول ہو، تو وہ سارے گڑے مردے ایک ساتھ ہی اکھاڑنا شروع کر دے، کیوں کہ اب تک بہروز اتنا محتاط رہا تھا کہ سب جانتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو صرف میں اور فیروز وہاں رُکے، باقی تمام ممبرز نے حسب توقع جانے سے پہلے اپنا آخری فیصلہ بہروز کو سنایا کہ وہ ایسے مشکل وقت میں

بہروز کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ واقعی، بہروز نے اپنے ارد گرد بہت چن کر لوگ جمع کیے تھے۔ فیروز نے ان کے جانے ہی دروازہ بند کیا اور پریشانی سے بولا ”ہم سب یہیں رہیں گے، مگر آپ کو فوراً یہاں سے کسی اور ملک نکل جانا چاہیے۔ ان حالات میں بھارت یا پاکستان ہی بہتر رہے گا۔ میں آج رات ہی بڑی لانچ تیار کروا دیتا ہوں۔ سمندر میں ہمارے وفاداروں کی کمی نہیں، دوراتوں کے بعد آپ کسی محفوظ مقام پر ہوں گے۔“

بہروز نے اطمینان سے فیروز کی پوری بات سنی۔ ”کبھی کبھی روپوشی انسان کو مزید ظاہر کر دیتی ہے فیروز خان..... تم بُری زاد کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ۔ اُس کے ہاتھ ابھی صاف ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے بھی دوسروں کی ساتھ شامل کر کے دھریا جائے۔“ بہروز کریم کا لہجہ حتمی تھا۔ فیروز مایوس سا وہاں سے پلٹ گیا، میں نے بھی واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو میرے عقب میں بہروز کی آواز گونجی۔ ”جب کوچ کا وقت آئے تو خدمت کرنا، چلے جانا۔“ میں نے پلٹ کر جواب دیا ”آپ جانتے ہیں، آپ ہمیں قانون میں مقرر سزا سے بھی بڑی سزا دے رہے ہیں۔“ بہروز نے سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور ایک چیک میری جانب بڑھایا۔ ”اسے رکھ لو، بُرے وقت میں کام آئے گا، اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اپنے آپ کو اتنا حقیر مت جانو، یہ دنیا بُرے ہوئے کو مزید مارتی ہے، مگر جو سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اسے لٹا کرے، اُسی کو سلام کرتی ہے، دنیا کو لاکڑا کرنا سیکھ لو بُری زاد..... محبت زندگی کی پہلی یا آخری ضرورت نہیں ہوتی اور تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس دل کے بہلانے کو یہ ایک عذر تو موجود ہے کہ کسی کی محبت تمہارا مقدر ہی نہیں۔ مسئلہ تو ہم جیسوں کا ہے، جو محبت پا کر خود اسے اپنے ہاتھوں سے کھود دیتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اکثر تم پر رشک آتا ہے کہ کاش، تمہاری طرح میں بھی عمر بھر اس عذاب سے محروم رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“ میں نے حیرت سے بہروز کی طرف دیکھا۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ”کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا.....“

لیلیٰ صبا کے قتل کی تفتیش کا دائرہ تیزی سے ہمارے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے فیروز سے بہروز کریم کو دہنی سے نکال لے جانے کی ایک آخری کوشش کرنے کو کہا۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ اب شاید یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہ ہو، کیوں کہ اس کی اطلاع کے مطابق پولیس نے محل کے ارد گرد راستوں کی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ فیروز نے ایک حتمی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم سب نے مل کر کسی نہ کسی طرح بہروز کریم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ٹھیک تین دن بعد ہم سارے کارندے مع بہروز، دو بڑی لالچوں میں بٹکا کر یا کسی اور جانب نکل جائیں گے۔ ہمارے چہروں پر لکھا فیصلہ پڑھ کر بہروز سمجھ گیا کہ ہم سے مزید بحث بے فائدہ رہے گی۔ فیروز خان کو ایسے معاملات کی سنگینی کا اندازہ اور ان سے نمٹنے کا طریقہ خوب آتا تھا۔ اس نے ہمارے فرار والی رات ہی محل میں بہروز کی سال گرہ کا جشن اور پارٹی منعقد کرنے کا ڈھونگ رچایا اور شہر کے تمام رئیسوں کو دعوت نامے بھی ارسال کر دیے گئے۔ طے پایا کہ شام کو اندھیرا ڈھلتے ہی جب مہمانوں کی آمد شروع ہونے والی ہوگی، فیروز خان، بہروز اور دیگر چند کارندوں کو لے کر پہلی لانچ پکڑ لے گا، تب تک میں اور دیگر عملہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہیں گے اور موقع ملتے ہی ہم بھی نکل جائیں گے۔ تیسرے دن شام ہی سے محل میں بل چل سی مچ گئی۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ پہرہ کافی سخت ہے، اس لیے انہیں اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے فیروز کے سامنے ایک ہمیشہ کی آزمائی ہوئی ترکیب تجویز کی۔

فیروز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، یہ جواب بھی کھیل لیتے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، مگر پھر تمہارا یہاں سے جلدی نکلنا شاید ممکن نہ ہو۔“

بہروز ابھی اپنی خواب گاہ میں تھا۔ میں نے اس کے ڈرائیور کو بہروز کی خاص گاڑی لگانے کو کہا اور گھر سے نکلتے ہوئے لاؤنج میں پڑے بہروز کے سگار کیس سے ایک سگار اٹھا لیا۔ ڈھلتے اندھیرے میں جب بہروز کی کار محل سے باہر نکلی، تو میں ایسے زاویے کے ساتھ ہاتھ میں سگار لیے پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ پہلی نظر میں باہر سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کار میں بہروز بیٹھا کہیں جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ محل کے دربانوں نے بھی کھٹ سے سلام جڑ دیے۔ شاید ہم لوگوں سے کہیں زیادہ، ان کے معمولات سے مانوس اور آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری ذاتی اشیاء، اوقات کار اور عادات ہماری پہچان بن جاتے ہیں اور خود ہم اس پہچان میں کہیں کھو سے جاتے ہیں۔ بہروز کی مخصوص کار کے محل سے نکلتے ہی ایک سیاہ رنگ کی بڑی چروکی جیپ ہمارے تعاقب میں چل پڑی۔ ہمارا پرانا طریقہ شاید ابھی تک کارآمد تھا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار بڑھانے کو کہا اور ہم تین چار گھنٹے تک دہنی کی سڑکوں پر ادھر سے ادھر بے مقصد کار دوڑاتے رہے۔ تعاقب میں آنے والی جیپ کو ہم نے برابر یہی تاثر دے رکھا، جیسے ہم اس کے تعاقب سے جان ٹھہرانے کے لیے بار بار کار کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ پرانی انگریزی جاسوسی فلموں میں، میں نے ایسے مناظر بار بار دیکھے تھے، مگر تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی میں کبھی یہ مناظر حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ شاید قدرت انسانی ذہن کی اڑان وہاں تک رکھتی ہے، جہاں تک اس جہانِ ناتمام میں ممکنات کی حد ہو۔ ورنہ یہ مصنف، رائٹر اور قلم کار وہ سب کچھ کیسے سوچ اور لکھ لیتے ہیں، جو کبھی اُن کے ساتھ پیش ہی نہ آیا ہو۔ یہ تخیل کیا بلا ہے، جو انہونی کو بھی ہونی کر کے لکھتا ہے۔ مگر میرا پیچھا کرنے والی جیپ میرا تخیل نہیں تھی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ بہروز کریم اور دیگر ساتھی محل سے نکل کر ساحل تک پہنچ گئے ہوں گے، تب میں نے ڈرائیور کو گاڑی محل کی طرف موڑنے کو کہا۔ میری توقع کے مطابق فیروز خان ان سب کو لے کر نکل چکا تھا۔ مہمانوں کی بھیڑ نے کار اندر آتے دیکھی تو سب ہماری طرف لپکے۔ میں نے بے مشکل ان سے معذرت کی کہ مالک کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ لوگ تب تک عشاءِ تناول فرمائیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان مہمانوں میں سے کچھ کا تعلق قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی ضرور ہوگا، مگر مجھے بہر حال ان کا یہ بھرم آخری وقت تک سمیٹ رکھنا تھا کہ بہروز ضروری کام نمٹا کر آتا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں، تنہائی آس پاس لوگوں کی غیر موجودگی کا نام نہیں، ہمارے آس پاس موجود انسانوں میں ہماری غیر دل چسپی ہمیں تنہا کرتی ہے۔ میں بھی اس پارٹی کے ہجوم میں تنہا کھڑا محفلِ برخاست کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہا۔ پھر اچانک محل کے گیٹ پر بہت سی گاڑیوں اور مخصوص سائرن کا ایک شور سا اٹھا۔ چند لمبے بعد دہنی پولیس کا ایک بڑا فرمیرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انداز اس کے عہدے سے کہیں زیادہ حکمانہ تھا۔

”تمہارا مالک بہروز کریم کہاں ہے.....؟“ ”بس آتے ہی ہوں کے مالک۔“ افسر مخصوص عربی لہجے کی انگریزی میں گرجا۔ ”ہمارے پاس اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا ”جب وہ واپس آئیں تو گرفتار کر لیجیے گا۔“ مہمان یہ سارا معاملہ دیکھ کر دھیرے دھیرے چھٹنے لگے اور پھر کچھ دیر بعد اس افسر کا ماتحت باہر سے بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے افسر کے کان میں کچھ کہا۔ افسر کی ہنویں تن گئیں اور وہ غصے میں میری طرف پلٹا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھرا آئی۔ ”میرے پاس تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے.....“

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کھتا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرادل زور سے دھڑکا، اس پولیس افسر نے مڑ کر اپنے ماتحت سے عربی میں کچھ کہا اور پھر میری طرف پلٹا ”میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں، تمہارا مالک اور دیگر ساتھی پہلے ہی پکڑے جا چکے ہیں۔ فی الحال، تم پر کوئی واضح الزام نہیں، مگر شک کی بنیاد پر حراست میں لیا جا رہا ہے۔“ کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے، شاید ہمارے اندر ابھرتے خوف اور وہم کا تقدیر اور پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہ راست رشتہ ہوتا ہے، اسی لیے جب مجھے گرفتار کر کے لاک اپ پہنچایا گیا، تو میں نے اپنے خدشات کے عین مطابق بہروز کریم، فیروز اور دیگر عملے کو مختلف چھوٹے چھوٹے حوالات نما کمروں میں بند پایا۔ بہروز کے قانونی مشیروں اور چوٹی کے وکلاء کی ٹیم بھی پولیس حکام کے ساتھ بحث کرتی نظر آئی۔ مجھے بھی ایک لاک اپ میں دھکیل دیا گیا، اور میں اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ انسان کی ساری بے چینی اور بے قراری اُسی وقت تک ہوتی ہے، جب تک اختیار اُس کے ہاتھ رہتا ہے، جب فیصلوں کے مختار دوسرے ہو جائیں تو پھر اک اُن جانا سانسکون اور ٹھہراؤ جیسے سارے وجود کی بے چینی سمیٹ لیتا ہے۔ میرا فیصلہ بھی اب میرے صیادوں کے ہاتھ تھا، پھر مجھے بھلا کا ہے کی فکر ہوتی۔ اگلے روز ہمیں عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ایک چھوٹے سے ہال نما کمرے میں جمع کیا گیا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حجب معمول سکون تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”کہو پری زاد! نیند کیسی رہی؟“ کہتے ہیں مشکلات سے دُور بھاگ کر ہم صرف اس مصیبت کے حل سے اپنا فاصلہ بڑھا رہے ہوتے ہیں، مگر نہ مشکل تو ہمارے ساتھ ہی چل رہی ہوتی ہے۔ بہروز کے وکلاء نے ایڈی چوٹی کا زور لگالیا، مگر اس کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ رات کو جب لاک اپ میں سنا نا چھا گیا، تو میں نے ساتھ والے لاک اپ کی دیوار پر دھیرے سے دستک دی ”آپ سو تو نہیں گئے مالک.....؟“ کچھ دیر بعد بہروز کی آواز گونجی ”کسی سوتے ہوئے سے یہ بڑا عجیب سوال ہوتا ہے؟“ میں نے ایک گہری سانس لی ”معذرت چاہتا ہوں مالک، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل عدالت میں قاضی کے سامنے مالکن کے قتل کا اعتراف کر کے جرم اپنے سر لے لوں گا، آپ میرے اعتراف کے بعد کوئی اعتراض نہ کریں، تو مہربانی ہوگی۔“ بہروز نے کچھ دیر توقف کیا، پھر اس کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری ”بہروز کریم اتنا ہی بوجھ لا داتا ہے، جتنا وہ ڈھوسکے۔ تمہارے اس احسان کا بوجھ بہت بھاری ہے پری زاد، اور ویسے بھی ولید کا باپ اس کی لیلیٰ سے پرانی رفاقت کے سارے ثبوت لے کر آیا ہے، تم پر یہ قتل ڈال بھی دیے جائیں تو دوسری طرف کا کوئی بھی اچھا وکیل بہت جلد جج کی تہہ تک پہنچ کر اُسے عدالت کے سامنے پیش کر دے گا۔ میں نے زندگی میں بہت جرم کیے ہیں۔ کسی نہ کسی مقام پر تو رتی کو تنگ ہونا ہی تھا۔ تم اطمینان سے سو جاؤ، مجھے ابھی بہت جاگنا ہے۔“ پھر شاید پوری رات میں اور بہروز اپنی اپنی آہنی کوٹھریوں میں ساری رات جاگتے رہے۔ یہ ظاہر ہم دونوں ہی قیدی تھے، لیکن دونوں میں کتنا فرق تھا، ہم میں سے ایک ساری دنیا جیت کر اور جہاں بھری نعمتیں سمیٹ کر اس عقوبت خانے میں پہنچا تھا اور شاید ہی اس کی کوئی حسرت باقی بچی ہو، جب کہ دوسرا وہ بد نصیب تھا، جس کی زندگی ہی عُمر بھر حسرت کا دوسرا نام رہی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ تقدیر اس دنیا میں ایک ہی وقت میں کسی عرب شہنشاہ یا امریکی ارب پتی کے گھر پیدا ہونے والے اور میری کچی بستی میں جنم لینے والے دو بچوں میں کیسے توازن رکھتی ہوگی۔ بادشاہ اور فقیر کے گناہ و ثواب برابر کیسے تولے جاسکتے ہیں، چاہے وہ دونوں ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ آخر اس فرق کی کوئی تو جزا ہوگی۔ کوئی تو صلہ یا انعام ملے کر رکھا ہوگا اور والے نے۔ کسی مقام پر تو اس فقیر کی محرومیوں کا حساب برابر کیا جائے گا یا پھر اسے بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا۔

اگلے روز عدالت میں قاضی کے سامنے وکلاء کی بحث شروع ہونے سے پہلے ہی کریم نے اپنا گناہ قبول کر لیا اور ساتھ ہی عدالت سے درخواست کی کہ گرفتار شدہ عملے میں بہت سے ایسے بھی ہیں، جن کا اس کی مجرمانہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں، لہذا انہیں ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ ہم سب گم سم کھڑے بہروز کریم کا بیان سُنتے رہے۔ اس نے اپنے بیان میں اپنے ہر جرم کا مرکزی کردار خود ہی کو ٹھہرایا۔ فیروز اپنے مالک کی باتیں سُن کر پھوٹ کر رو پڑا۔ ہم سبھی کی پلکیں غم تھیں۔ بہروز کریم کا بیان کسی زندہ انسان کا اقرار نامہ نہیں لگتا تھا۔ کہتے ہیں، زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہم بہت دیر بعد اسے جینا شروع کرتے ہیں، لیکن بہروز کے بیان کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس نے زندگی کو جی بھر کے جی لیا ہے، اتنا کہ اب وہ اس تماشے سے ادب چکا ہے۔ کچھ لوگ صدیوں زندہ رہ کر بھی ایک پل زندگی جی نہیں پاتے اور کچھ پل بھر میں صدیوں کا مزہ کشید کر لیتے ہیں، تو پھر ہم کسی بھی شخص کی عمر کو سال اور مہینوں میں کیوں ناپتے ہیں، یہ کیوں نہیں کہتے کہ فلاں شخص دو پل جیا اور پھر مر گیا اور فلاں عُمر بھر جیتا رہا۔ ایک مہینے کے اندر قاضی نے بہروز کو موت کی سزا سنائی۔ فیروز خان کو بھی اس کی معاونت کے جرم میں زندگی کی قضاء کی سزا ملی۔ چند کو عمر قید ہوئی اور مجھ سمیت کچھ دوسرے نامکمل شہادتوں کی بنیاد پر رہا کر دیئے گئے۔ انصاف وہی ہوتا ہے، جو فوری ہو، ہمارے ہاں تو انصاف اتنی دیر سے ملتا ہے کہ خود انصاف سزا بن جاتا ہے۔ بہروز کریم نے اپنی ساری دولت، جائیداد اور اثاثوں کو دھتھوں میں تقسیم کر کے آدھا حصہ اپنی بیوی اور بچوں میں بانٹ دیا اور آدھا اپنے تمام بچ جانے والے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے وہ تمام ٹرسٹ اور فلاحی ادارے بھی ہمیشہ کے لیے یک جا کر کے ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے زیر اہتمام کر دیئے، جو اس کی سرپرستی میں چلتے تھے اور جن کی کمائی سے ہزاروں ضرورت مندوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ظالم بہت نخی ہوتا ہے۔ بہروز کریم اگر ظالم تھا تو سخاوت کا یہ معیار اس کے شایان شان تھا۔ شاید چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا گناہ گار بھی کہیں نہ کہیں اپنے اعمال کا وزن برابر رکھنے کی

شدید خواہش میں مبتلا رہتا ہے۔ ہم کچھ بھی کر لیں، مگر سزا اور جزا کا یہ نظام خود بہ خود ہی ہماری رگوں میں سرایت کیے رہتا ہے۔ میں بہروز کریم کے اٹائوں کی وصیت پڑھتے ہوئے رو پڑا۔ اس نے اپنے محل میں پڑا ہوا بڑا پیا نو میرے نام لکھ دیا تھا، اور پھر ساتھ ہی ایک ضمنی نوٹ میں تحریر تھا کہ چون کہ اس پیا نو کا وزن بہت زیادہ ہے اور بہروز کو خدشہ ہے کہ اس کی محبوب بیوی کا یہ پسندیدہ پیا نو محل سے کہیں منتقل کیے جانے کی صورت میں اپنی اصل شکل و ہیئت کھو نہ دے، لہذا وہ جائداد، جہاں وہ پیا نو پڑا ہوا ہے، تمام تر محل اور انیکسی سمیت ہدی زاد کے نام کی جاتی ہے۔ بہروز جاتے جاتے ہم سب کے نام اتنا کچھ کر گیا تھا، جو ہم سب کی سات نسلوں کے لیے کافی تھا۔ اس نے اپنے تمام اداروں میں کام کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ افسر سے لے کر ایک معمولی نوکر اور چڑا سی تک کو برابر بانٹا تھا۔

آخری ملاقات کی رات، جب ہم سب کا رکن اس سے آخری بار مل کر واپس لوٹ رہے تھے، تو میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا رہا۔ سب جا چکے، تو بہروز نے میری طرف دیکھا۔ ”تم مجھ سے نہیں ملو گے ہدی زاد.....“ مجھ سے رہائشیں گیا اور میں تمام ادب و آداب بالائے طاق رکھ کر روتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا اور پھر مجھے سنبھالتے ہوئے بہروز بھی رو پڑا۔ اس آہنی اور فولادی وجود و اعصاب کے آدمی کو میں نے پہلی بار نم آنکھیں لیے سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے ”کیوں کیا آپ نے ایسا.....؟ کیوں خود کو موت کے منہ میں جھونک دیا، آپ کے دکاء اور قانونی مشیر اتنے اہل تو تھے کہ آپ کی سزا کو کم از کم عرقید میں تبدیل کر دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سزا آپ نے اپنے لیے خود تجویز کی ہے، قاضی نے تو بس اپنے دست خط ثبت کیے ہیں، آپ کے فیصلے پر۔“ بہروز نے سراٹھایا ”شاید میں لیلیٰ کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا ہدی زاد۔ لیکن یہ محبت بڑے بڑے تناور درختوں کو دیمک کی طرح کھا کر ڈھا سکتی ہے۔ یہ احساس مجھے بہت دیر میں ہوا۔ میں نے اپنے لیے یہ سزا اس لیے تجویز نہیں کی کہ میں نے اُسے مار کیوں ڈالا بلکہ میں نے خود کو یہ سزا اس لیے دی ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ جب کہ میں اس کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اب میری واپسی ناممکن ہے۔ مگر یہ راز تب کھلا، جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ تب میں نے جانا کہ میں بھی اب اس کے بنا جی نہیں پاؤں گا۔ اگر مزید زندہ رہتا تو یہ منافقت ہوتی۔ اور بہروز نے آج تک ہر گناہ کیا ہے، سوائے منافقت کے۔“ اس نے مجھے آخری مرتبہ سمجھنے کر گلے لگایا ”اپنا خیال رکھنا، بہت قیمتی ہوتم، مگر نہ جانے کیوں، خود کو اتنا ارزاں کر رکھا ہے۔“ میں ایک بار پھر رو پڑا۔ بہروز سے رخصت ہونا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا، مگر سپاہی میرے سر پر آکھڑا ہوا۔ واپسی پر میں فیروز خان کی کوٹھری کے پاس رُک گیا، وہ آہٹ سن کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ میں

نے نم پلکوں سے اس کا استقبال کیا ”جار ہے ہو فیروز؟“ وہ دُکھ سے مسکرایا ”ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مالک کے ساتھ ہی چلا جاؤں، تو بہتر ہے، میں نے ان کی زندگی کی حفاظت کی قسم کھا رکھی تھی، دعا کرو کہ کل مجھے اُن سے پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، ورنہ میں اوپر جا کر خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا.....؟“ میں نے فیروز کا کاندھا تپتپہٹپہٹایا ”تم سے بڑھ کر وفاداری اس دنیا میں بھلا کسی اور نے کیا بھائی ہوگی۔ بے وفا تو ہم ہیں، جنہیں تم یہاں تنہا کسی آسروے کے بغیر چھوڑے جارہے ہو۔ کہاں ملے گا اب مجھے تم جیسا سچا اور وفادار دوست؟“ فیروز مسکرایا ”پاکستان میں میرا ایک بھائی ہے کبیر خان، ضرورت پڑے تو اسے اپنے پاس بلا لینا، ہم دونوں کا ایک ہی خون ہے۔ اب تم جاؤ ہدی زاد، مجھے اپنی آخری عبادت کرنی ہے۔ شاید یہ آخری عہدہ ہی وہاں کام آجائے، ورنہ عمر تو بس رائیگاں گئی۔“ میں آنکھوں میں آنسو لیے بوجھل قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

بہروز اور اس کے وفادار فیروز کی آخری رسومات ایک ساتھ ادا کر کے انہیں اسی شہر میں دفن دیا گیا، جہاں انہوں نے عروج کی آخری منزل سُر کی تھی اور جہاں وہ ایک ساتھ زوال پزیر ہو گئے، بہت دنوں تک تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ غم کی شدت شاید ہماری قوت گویائی بھی سلب کر لیتی ہے۔ میں گھنٹوں بڑے ہال میں گم مضم بیٹھا اس بڑے پیا نو کو دیکھتا رہتا، جسے کبھی لیلیٰ صبا بیٹھ کر بجایا کرتی تھی۔ شاید اس کی نازک انگلیوں کے نشانات بھی ابھی تک اس پیا نو کے سُر پر ثبت ہوں گے۔ میرا جی ہی نہیں مانتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ لگا کر اس کے نشان مٹا دوں۔ پھر ایک شام مار تھا واپس آ گئی اور مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے پُڑے کے لیے انگلینڈ گئی ہوئی تھی، جب یہ ساری واردات ہوئی، میں نے مار تھا کو پھر سے کام پر رکھ لیا اور اس سے انیکسی میں شفٹ ہو جانے کی درخواست بھی کی۔ جانے کیوں وہ مجھے اس محل اور لیلیٰ صبا کا ایک حصہ نظر آتی تھی۔ رفیق کو بھی میں نے دوبارہ دعویٰ واپس بلوایا تھا۔ مگر اس نے محل میں منتقل ہونے سے معذرت کر لی ”نہیں پیارے! یہاں پر ٹو ہی جتا ہے، مالک یہ سب کچھ تیرے نام کر گئے ہیں، مجھے اسی فلیٹ میں رہنے دے۔“ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب یہی ہوگا۔ ”ٹھیک ہے، مگر ایک شرط تمہیں میری بھی ماننی ہوگی، ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے دل سے اپنا دوست نہیں مانا۔“ ”کیسی شرط.....؟“ میں نے دراز سے ایک چابی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ”تم ہمیشہ سے یہاں ایک بہت اچھا پاکستانی ریسٹورنٹ کھولنا چاہتے تھے ناں، یہ تمہارے ریسٹورنٹ کی چابی ہے۔“ رفیق کچھ دیر تک ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے مجھے آگے بڑھ کر گلے لگ لیا ”تو صرف نام ہی کا نہیں، دل کا بھی ہدی زاد ہے.....“ بہروز کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ امیر کیسے امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں، دولت ایک ایسا مقناطیس ہے، جو صرف دولت کے لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ بہروز کے شروع کیے گئے درجنوں منصوبے جو میرے حصے آئے تھے، وہ پیسا کھینچنے کے کچھ ایسے ہی مقناطیس تھے، میرا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ میں اپنے نیجرز کی بتائی ہوئی اسکیمز میں پیسے لگاؤں اور پھر ہفتوں بیٹھ کر ان سے حاصل ہونے والا منافع گنتا رہوں۔ اس سے کہیں زیادہ محنت تو میں استاد مستانہ کے ورکشاپ پر دن کے چند گھنٹوں میں کر لیتا تھا۔ یا پھر شاید ان امیروں کو بیٹھ کر یوں دولت گنتا بھی محنت ہی لگتی ہو، لیکن میں اس جمع تفریق کے کھیل سے چند مہینوں ہی میں اکتانے لگا۔ دولت مند کو دولت خرچ کرنے کا سلیقہ آنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہی دولت اس کے لیے سرد رہنے لگتی ہے۔ میرے نیجرز مجھے روزانہ پیسا کمانے کے نت نئے گرتاتے اور پھر جب ان کے منصوبے کام یاب ہو جاتے تو وہ پارٹی کرتے، جشن مناتے۔ انہیں اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ میں ان کی دماغی عرق ریزی کے نتیجے اب بہت اکتاہٹ سے سُنتا تھا۔ اُن ہی دنوں اسپین کی ایک بڑی تعمیراتی کمپنی نے ہمارا ٹینڈر منظور کر لیا۔ میں سفر سے بہت کتر اتا تھا اور حتی الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ مجھے خود کہیں جانا نہ پڑے، مگر اس بار کچھ ایسی صورت حال بنی کہ مجھے بارسلونا جانا ہی پڑا۔ یہ پیسا بڑے کمال کی چیز ہے۔ ایک ہی جیسے خوش پوش اور معزز دکھائی دینے والے انسانوں کو پل بھر میں درجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری فلائٹ کا ٹکٹ عملے نے بزنس ایگزیکٹو کلاس میں سب سے اونچی تقسیم کا ٹکٹ کر دیا تھا، لہذا کچھ ہی دیر میں مجھ سے کہیں زیادہ خوش لباس اور اونچے درجے کے دکھائی دینے والے مسافر جہاز کے پچھلے حصے میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز کا سارا عملہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ مجھے جانے کیوں اپنے کالج کے روت پر چلنے والی لوکل بس یاد آ گئی، جس کے پائیدان پر لٹکتے ہوئے میں نے کالج تک اُن گنت سفر کیے تھے، کیوں کہ میرے پاس اندر بیٹھنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے اور کنڈکٹر ترس کھا کر چند سٹکوں کے عوض مجھے پائیدان پر لٹکنے ہی کی اجازت دیتا تھا۔

اسپین کے جس سات ستارہ ہوٹل میں میرا قیام تھا، اس کے صدارتی سوئٹ سے باہر دیکھنے پر دو روسفید پتھر اور لکڑی سے بنا ایک بہت بڑا سا گول اکھاڑہ دکھائی دیتا تھا۔ میرے میزبانوں نے اگلی شام معاہدہ طے ہو جانے کی خوشی میں مجھے اُسی اکھاڑے میں بھینسے کی انسان سے جنگ دکھانے کا اہتمام کر ڈالا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر میزبان بہ ضد تھے کہ کوئی اسپین آئے اور یہ تماشا نہ دیکھے، تو اسے کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو دنیا کے سبھی بڑے شہر اب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ وہی بھاگ دوڑ، نفسا نفسی، سب کا ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ خوش اور مطمئن جان کر خود کو مزید مشقت میں مبتلا کرنا، مگر یہ شہر باقی بڑے شہروں سے کچھ جُدا دکھائی دے رہا تھا، مشرقی اور مغربی تعمیر کا سنگم، مجھے بچپن میں آند لاہریری سے کرائے پر ملی گئی الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ وہی محرابیں، وہی ستونوں کی قوس قزح، اندرون شہر اینٹوں کی کئی گلیاں اور رستے، نئی تعمیر کا شاہ کار، الف لیلوی گھر اور عمارتیں..... مسلمان کیا تھے، اور کیا سے کیا ہو گئے۔ دنیا کی تاریخ میں جتنا عروج اور پھر جتنا زوال ہم مسلمانوں نے دیکھا ہے، شاید ہی کسی اور قوم اور مذہب نے دیکھا ہو، شام چار بجے ہم اکھاڑے میں اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اکھاڑہ کچھ کچھ تماشا نیوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان سدا کا وحشی ہے اور اسے یہ وحشت بھرے تماشے دیکھنے میں ہمیشہ ہی لطف آتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں سیاہ بِل فائٹنگ کے سوٹ پر سُرخ جیکٹ اور سُر پر کالا ہیٹ پہنے ایک سُرخ چادر لہراتا، ہسپانوی بِل فائٹر اکھاڑے میں داخل ہوا، تو تماشا نیوں نے تالیوں اور سیٹیوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کنواری لڑکیوں نے اس وجہ لڑکے پر پھولوں کی بارش کر دی۔ مگر بِل فائٹر نے صرف ایک گلاب اٹھا کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا، جو اس کی محبوبہ نے اس پر پھینکا تھا۔ میرا خاص میزبان مجھے یہ ساری روداد کسی رواں تہرے کی طرح سُنا رہا تھا۔ یہ لڑکا اسپین کے بہترین بِل فائٹر میں سے ایک تھا، جسے لوگ انتونیو کے نام سے جانتے تھے۔ انتونیو آج تک اسپین کے ننانوے جنگی بھینسوں کو ایسے اکھاڑوں میں ہرا کر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور آج اس کا یہ ایک سوواں مقابلہ تھا۔ اور اس نے اپنی محبوبہ ماریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا سیکڑا مکمل کر کے ماریا سے شادی کر لے گا۔ سارا شہر یہ بات جانتا تھا اور اسی لیے آج اکھاڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دوسری جانب اندھیرے قید خانے میں کھڑا بھینسا بھی آج اپنی سوویں لڑائی لڑنے جا رہا تھا۔ لوگوں نے اس کی وحشیانہ طاقت کی وجہ سے اس کا نام ”کھر“ رکھ چھوڑا تھا، اور کھر نے اپنے ننانوے گزشتہ مقابلوں میں کسی بھی بِل فائٹر کا جسم ادا جیڑے بنا اسے اکھاڑے سے واپس نہیں جانے دیا تھا۔ مگر اپنے وقت کے یہ دو بہترین لڑکا آج پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے مد مقابل آرہے تھے۔ انتونیو نے اپنی تلوار کی چمکتی دھار کو مچھو کر دیکھا، اور کھر نے اپنے بند کھر نے اپنے گھروں سے ریتیلی زمین کو کھر ونچا، ماریا نے انتونیو سے وعدہ لیا تھا کہ اس آخری بھینسے کو زیر کرنے کے بعد وہ اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دے گا، کیوں کہ ماریا اپنے محبوب کے توانا جسم پر مزید نوکیلے سیٹگوں کی کاٹ اور زخموں کے نشان نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ انتونیو نے اپنی سیاہ بھلی پوشاک کے سنہری بٹن بند کیے اور گٹھنوں تک لمبے مخصوص چمڑے کے جوتوں کے تسمے باندھے اور تلوار کی نوک زمین پر ٹیک کر ایک شان بے نیازی سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لڑائی کے لیے تیار ہے۔ تماشا نیوں کی تالیوں، سیٹیوں اور شور سے کان پڑی آواز سُنا ئی نہیں دے رہی تھی۔ ماریا نے اپنے سر پر نئے سیاہ جالی کے نقاب والے ہیٹ کو ذرا سا سر کا کر انتونیو کو سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑا دوسرا سُرخ گلاب بھی اُس پر نچھاور کر دیا۔ ٹھیک اسی لمحے میری نظر اکھاڑے میں دوسری جانب بیٹھے ایک شخص پر پڑی، جو میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ بلایا اور تعظیم سے سر جھکا کر سلام کیا۔ شاید میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا، مگر اس وقت میری پوری توجہ انتونیو اور کھر کے مقابلے پر تھی۔ کھر کی آنکھوں سے کئی ہٹا کر اس کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اور اب وہ اکھاڑے میں داخل ہونے کے بعد اپنے سوویں شکار انتونیو کو اکھاڑے کے درمیان کھڑا سُرخ کپڑا لہراتے دیکھ رہا تھا، مگر کھر اتنی جنگلوں کے بعد ایک بات تو اچھی طرح جان چکا تھا کہ اس کا اصل ہدف وہ بے جان سُرخ کپڑا نہیں بلکہ اس کے عقب میں کھڑا وہ سفاک دشمن ہے، جو پہلے اسے تماشے کی غرض سے خوب تھکائے گا اور پھر بڑے حال کرنے کے بعد ٹھیک اس کی دو آنکھوں کے درمیان نازک جلد والے حصے میں اپنی تیز دھار تلوار پوری طرح گھونپ کر اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا، مگر اسے یہ لمحہ آنے سے پہلے ہی اپنے دشمن کو اپنے نوکیلے سیٹگوں میں پرو کر آسمان کی جانب اچھال کر اس کے جسم کو ادا جیڑ کر رکھ دینا ہو گا۔ بِل فائٹنگ دراصل بھینسے اور لڑاکے (بِل فائٹر) کے درمیان اعصاب کی جنگ ہوتی ہے اور جو اپنے اعصاب قابو میں رکھے، وہی فاتح بن کر اکھاڑے سے باہر نکلتا ہے۔

انتونیو نے سُرخ بھلی کپڑا لہرایا، جنگ شروع ہو گئی۔ کھر کا پہلا وار خالی گیا اور انتونیو نے اپنی تلوار سے اس کے جسم پر ایک چرکا لگا کر کھر کے مضبوط جسم پر پڑے درجنوں دانگوں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا۔ کھر غضب ناک ہو کر پلٹا اور دُور سے بھاگتے ہوئے قریب آ کر اچانک اپنا زانو یہ بدل لیا۔ اس کے تیز دھار سینگ کی نوک نے انتونیو کے پہلو میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ تماشا نیوں کی چیخیں نکل گئیں اور ماریا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ انتونیو اور کھر دونوں ہی جان چکے تھے کہ ان کا مقابلہ آج کسی عام حریف سے نہیں۔ انتونیو کے ہاتھ میں پکڑی سُرخ چادر اب دھیرے دھیرے چھیتروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی اور جہاں کھر کا جسم انتونیو کی تلوار کے چرکوں سے لہو لہان تھا، وہی انتونیو کا بدن بھی بے حد مہارت اور احتیاط کے باوجود خراشوں سے بھر چکا تھا اور دونوں ہی شدید تھکن سے نڈھال تھے۔ ماریا جب اپنے محبوب کو اس خون خوار قاتل بھینسے کے جسم سے مَس ہوتے دیکھتی تو اس کے حلق سے بے اختیار چیخ بلند ہو جاتی۔ اس نے چلا کر انتونیو سے کہا ”انتونیو! بس کر دو، میرے فائٹر، یہ دیوانگی ہے۔ مقابلہ ختم کر دو۔“ مگر انتونیو نے مُسکرا کر اپنی زندگی کو دیکھا اور آخری بار چادر لہرا کر پھینک دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بھینسے کی آنکھوں کے درمیان تلوار گھونپنے کے لیے تیار ہے، مگر اس نے خود کو بھی کھر کے سامنے پوری طرح عیاں کر دیا تاکہ بھینسا ساری احتیاط بھلا کر تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور انتونیو موقع ملنے ہی اسے ختم کر دے، تماشا نیوں کا شور اور چیخیں آسمان تک بلند ہو رہی تھیں اور وہ سب انتونیو کو اس دیوانگی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انتونیو اپنی زندگی کا آخری مقابلہ ہار کر واپس پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ کھر نے پلٹ کر اپنے اس بہادر دشمن کو دیکھا اور چند لمحے رک کر دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو لٹے رہے اور پھر کھر غزا اتا اور منہ سے جھاگ بہاتا انتونیو کی طرف دوڑتے ہوئے لپکا۔ انتونیو نے اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں اکڑا کر تلوار کا دستہ مضبوطی سے اپنے ہوا میں اٹھے دائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ کھر بھی سمجھ گیا کہ اس کا یہ آخری حملہ ان میں سے کسی ایک کے لیے تخت یا تختہ ثابت ہونے والا ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین جانور تھا اور دشمن کی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے اپنے جسم کو اچانک ایک جھکائی دی، تاکہ اپنے سر کی جانب لپکتی تلوار کی نوک سے بچ سکے، مگر تلوار دستے تک اس کے سر میں اتر چکی تھی۔ خود انتونیو بھی کھر کے ٹٹوں وزنی جسم کی زوردار ٹکر سے کئی فٹ ہوا میں اچھلا اور جب وہ زمین کی طرف گر رہا تھا تو کھر کے نوکیلے سینگ اس کے گرتے جسم کا انتظار کر رہے تھے۔ انتونیو کے جسم میں کھر نے اپنے سینگ پرودیے۔ اور ایک لمحے بعد ہی دونوں اکھاڑے کی ریتیلی زمین پر گرے اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے، دونوں نے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنے بہادر دشمن کو آخری پیغام دیا ”بہت خوب..... تم واقعی بہترین لڑاکا تھے میرے دشمن.....“ ماریا اپنے محبوب کی حالت دیکھ کر صدمے سے لہرائی اور وہیں گر کر بے سُدھ ہو گئی۔ سارے مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ عورتیں رو پڑیں، اپنی اپنی زندگی کے آخری مقابلے میں کھر اور انتونیو دونوں ہی برابر رہے تھے۔ تماشا ختم ہو چکا تھا۔ ٹھیک اُسی لمحے کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں اس سارے تماشے میں اتنا محو تھا کہ بُری طرح چوٹک گیا، یہ وہی شخص تھا، جس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے مجھے سلام کیا تھا۔ وہ دُسر انداز میں مسکرایا ”بہت تلاش کیا ہے تمہیں۔ آخر کار، آج پکڑے ہی گئے.....!!!“

(جاری ہے)



ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد رمانا رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دبیر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گروڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے اُس شخص کی طرف دیکھا، وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ ”کیا ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“ وہ مسکرایا ”ہم دونوں نہیں، صرف میں تمہیں جانتا ہوں..... تم پری زاد ہونا، بہروز کریم کے جاں نشین.....“ ”نہیں، میں صرف پری زاد ہوں۔ بہروز کا جاں نشین بننے کی اہلیت نہیں ہے مجھ میں۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”لوگ مجھے سیٹھ ابراہیم کے نام سے جانتے ہیں، بھارت کی شان، بمبئی میں رہتا ہوں۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بمبئی“ ہاں بھی، بمبئی، یہ نیا نام بمبئی ہمیں تو بالکل نہیں چلتا، جو بات بمبئی میں تھی، وہ اس بمبئی میں کہاں۔ جانے یہ لوگ شہروں کے نام کیوں بدل دیتے ہیں، کتنی یادیں جُوی ہوتی ہیں ان ناموں کے ساتھ، اب تمہارے لاہور کو کوئی کل سے اچانک ٹمکنو کہہ کر بلانا شروع کر دے، تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ میں اس کی بے تکلفی سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ”تم نے مجھے بتایا نہیں، تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“ سیٹھ ابراہیم میرے ساتھ چلتے چلتے اکھاڑے سے باہر آچکا تھا۔ میرے میزبان نے مجھے باہر آتے دیکھ کر گاڑی منگوالی۔ میں نے ابھی گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ سیٹھ ابراہیم کی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے آکر لگ گئی۔ سیٹھ ابراہیم نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ”میں شام کو تم سے ملنا چاہتا ہوں، تمہارا مالک، بہروز مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم بزنس پارٹنر تھے، باقی باتیں شام کو ہوں گی۔“ سیٹھ ابراہیم مجھے ایک نئی الجھن میں مبتلا کر کے چلا گیا، شام کو سوئمنگ پول کے کنارے کچھی کرسیوں پر وہ مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے براہ راست مدھے کی بات کی۔ ”ہاں بولو سیٹھ ابراہیم تمہیں مجھ سے ایسا کیا خاص کام ہے؟“ سیٹھ دھیرے سے مسکرایا ”تم نے شاید غور سے میرا نام نہیں سنا۔ مجھے ابراہیم کہتے ہیں۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میرے دم سے چلتی ہے، میں زیادہ تر دعائی میں رہتا ہوں۔ یہاں اسپین میں بھی ایک فلم کی افتتاحی تقریب میں آیا تھا۔ خوش قسمتی سے تم بھی یہیں مل گئے۔ شاید بہروز نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس کاروں کا کالا دھن ہماری فلم انڈسٹری ہی میں سفید ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا وہ پرانا رشتہ برقرار رہے۔ کہو، کیا کہتے ہو.....؟“ ”میں کچھ سمجھا نہیں.....؟“ ابراہیم نے اپنی آنکھوں پر لگا قیمتی دھوپ کا چشمہ اتارا ”ہم بھارتی فلموں میں اپنا روپا لگاتے ہیں، ایک فلم سٹر، اسی کروڑ تک چلی جاتی ہے۔ فلم چل جائے تو تین چار سو کروڑ لے آتی ہے، پٹ بھی جائے تو ہمارا کچھ نقصان نہیں، ہمارے ٹیکس کے وکیل اس نقصان کو تین گنا بڑھا کر ٹیکس کے گوشواروں میں بھر دیتے ہیں۔ مطلب چت بھی ہماری اور پٹ بھی۔ منافع ہو تو ساری دنیا کے سامنے سفید دھن آتا ہے، نقصان ہو تو ہمارا کالا دھن نقصان کے پردے میں ٹھپ جاتا ہے۔ بولو، پیسا لگاؤ گے فلم انڈسٹری میں؟“ ”تمہاری پیش کش کا شکریہ، مگر میرا کالا دھن کمانے یا اسے سفید کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے پاس جو ہے، وہ بھی میری اوقات سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہیں سنبھلتا۔“ سیٹھ ابراہیم طنز سے مسکرایا۔ ”جانتا ہوں، تم شاید پہلے بہروز کے خاص محافظ تھے، مگر یاد رکھو، اپنی سلطنت قائم رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے اور شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ بمبئی کی فلم انڈسٹری پر ہمیشہ سے انڈر ورلڈ کا راج رہا ہے۔ ہم ان کٹھ پتلیوں کو اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ آدھی رات کو بھی ہمارا فون چلا جائے تو ان کے بڑے بڑے ستارے بھاگے چلے آتے ہیں، ورنہ کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ شاہ رخ، سلمان، کرینہ یا کترینہ کسی کے بیٹے، بھائی کی سال گرہ میں کیک کنوانے چلے آئیں۔ یا ہمارے خاندانوں کی کسی شادی میں آئٹم نمبر پیش کرنے کو دوڑے آئیں۔ یہ سب

ہماری زیر زمین دنیا کی طاقت کے کرشمے ہیں اور سچ پوچھو، تو ان لوگوں پر حکومت کر کے بڑا مزہ آتا ہے۔ اور چوں کہ بہروز کریم ہماری اس سلطنت کا ایک اہم عہدے دار تھا۔ لہذا میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں بھی شمولیت کی دعوت دوں۔ آگے فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ ویسے تم اتنا لے دیے کیوں رہتے ہو۔ دعائی میں بھی نہیں نے تمہیں کبھی کسی تقریب میں نہیں دیکھا۔ سنا ہے، پیتے پلاتے بھی نہیں، کیوں یہ جوگ لے رکھا ہے تم نے.....؟“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”شاید یہی جوگ میرا مقدر ہے، اور میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے کسی سلطنت یا رتبے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں شاید ازلی طور پر غلام ہی پیدا ہوا ہوں، غلام ابن غلام..... ابن غلام۔ اور اب مجھ میں کوئی ”خوئے سلطانی“ پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ یہ تم جیسوں ہی کے سر پر بجتی ہے۔“ سیٹھ ابراہیم میری بات سن کر سنجیدہ سا ہو گیا۔ ”اتنے کڑوے سچ اتنی آسانی سے کیسے بول لیتے ہو تم.....؟ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے بہروز والے محل میں کسی

عورت کا بھی آنا جانا نہیں ہے۔ شراب، عورت اور جوا، اگر یہ سب تمہاری زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے، تو پھر اتنا پیسا بھی کس کام کا۔ آخر کوئی تو خواہش ہوگی تمہاری.....؟“ میں پُچ رہا، اب میں اسے کیا بتاتا کہ میری خواہش ساری دنیا سے جدا ہے۔ ہر آرزو سے بوا ہے۔ مجھے تو بس ایک نگاہ چاہیے۔ اپنے نصیب کی ایک جھلک، صرف ایک پیار بھری نظر، جو صرف میرے لیے ہو۔ ہنسی تھخیر، طنز، حقارت اور ترحم کے جذبات کے۔ سیٹھ ابراہیم جاتے جاتے چند لمحوں کے لیے رُکا۔ ”اچھے لگے ہوتے مجھے، لالچ نہیں ہے تمہارے اندر اور جو شخص اپنی خواہشوں پر قابو پالے، وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا ہے۔ کبھی کسی مقام پر میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا، ہاں، تمہیں ایک ضروری اطلاع بھی دینی تھی مجھے۔ دینی پولیس تم پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، نہ صرف تم پر بلکہ بہروز کے ہر قریبی ساتھی پر، ان کی خاص توجہ ہے آج کل..... تم اسی لیے بچے ہوئے ہو، کیوں کہ فی الحال انہیں تمہارے خلاف کسی غیر قانونی سرگرمی کی خبر نہیں ملی، مگر تمہیں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ بہت عرصے تک بہروز کو بھولنے والے نہیں ہیں۔“ سیٹھ ابراہیم واپس پلٹ گیا۔

میں دینی واپس پہنچا تو پہلی مرتبہ اپنی اطراف غور سے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے سیٹھ ابراہیم کی بات ٹھیک لگی۔ دینی اتر پورٹ ہی سے میری نگرانی شروع ہو چکی تھی، ایک سرکاری گاڑی نے گھر تک ہمارا پیچھا کیا اور پھر صبح وشام، آتے جاتے میں نے کچھ مخصوص چہروں اور گاڑیوں کو ہمیشہ اپنے گھر، دفتر اور ہر اس جگہ کے آس پاس پایا، جہاں مجھے پہنچنا ہوتا تھا۔ مجھے ایک عجیب سی گھٹن چوبیس گھنٹے محسوس ہونے لگی، جیسے وہ شہر نہیں، کوئی قید خانہ ہو، شاید سلاخوں کے پیچھے قید رہنا گھلے آسمان تلے قید رہنے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی اب میرا جی اس ریت اور سینٹ سے بنی عمارتوں کے صحرا سے اکتانے لگا تھا، لہذا میں نے اپنے ملک واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ رفیق نے یہ خبر سنی تو آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”خوش کر دیا تو نے یار..... پتا نہیں کیوں، مگر مجھے ہر وقت تیری طرف سے دھڑکاہٹ لگا رہتا ہے۔ ٹو چل، میں بھی تیرے پیچھے سب سمیٹ کر واپس پلٹتا ہوں۔ ہماری مٹی اور ہمارا خمیر یہاں کا نہیں ہے یار..... چاہے ساری عمر گزار لیں، پھر بھی ایک اجنبیت اور غیریت کا احساس ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ چاہے وہاں اپنے ملک میں کچھ بھی ٹھیک نہیں، پر اس اُن جانے پن سے تو نجات ملے گی۔“ میں نے اپنے باقی اسٹاف کو جمع کر کے اپنی واپسی کا فیصلہ سنایا تو وہ پریشان ہو گئے کہ پیچھے اتنا بڑا کاروبار کون سنبھالے گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں مبینے میں ایک دو بار چکر لگا لیا کروں گا اور پھر آج کل تو ہزار سہولتیں پیدا کر دی ہیں، ان نئی ایجادات نے۔ انسان جسمانی طور پر چاہے موجود نہ ہو، پر تصویر اور آواز کے ذریعے چوبیس گھنٹے رابطے میں رہ سکتا ہے۔ محل کے معاملات میں نے مارتھا کو کیئر ٹیکر بنا کر اس کے حوالے کر دیئے اور اس سے، دینی سے صرف بہروز کا سفید پیانو پاکستان بھجوانے کی درخواست کی۔

میرے عملے نے دو ہفتے کی جاں فشانی کے بعد میرے ہی شہر کے سب سے پوش علاقے میں میرے لیے ایک بنگلہ خرید کر اسے اپنے طور پر آراستہ بھی کر دیا تھا اور پھر میری روانگی کا دن بھی آ گیا۔ میں نے رفیق کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ میری واپسی کی خبر کو حتی الامکان زیادہ پھیلنے سے روکے رکھے، مگر میں اسے یہ تاکید کرنا بھول گیا کہ یہی احتیاط وہ پاکستان میں میرے خاندان والوں کے لیے بھی روار رکھے، اور پھر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا، میرے شہر کے ہوائی اڈے کے باہر انتظار گاہ میں میرا سارا خاندان گل دستے اور ہار لیے میرا انتظار کر رہا تھا، سبھی بہن بھائی اور ان کی اولاد، بھابھیاں اور بھابیوں کی بہنیں اور ان کے خاندان کے بزرگ، پورا ایک لشکر میرے استقبال کے لیے موجود کھڑا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا، جب میں یہاں سے دینی جانے کے لیے ایک پرانے رکشے میں اتر پورٹ پہنچا تھا۔ اُس دن میرے گھر کے صحن تک بھی کوئی مجھے رخصت کرنے نہیں آیا تھا۔ وقت بھی کیسی کروٹیں بدل لیتا ہے۔ نہ جانے کیسے پل میں بدل جاتے ہیں، یہ دنیا کے بدلنے رشتے..... ساری عمر جنہوں نے ہدی زاد پر سنگ باری کی، آج وہی لوگ پھولوں کی پٹیاں نچھاور کر رہے تھے، سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کے برائے پتھروں نے اتنی چوٹ نہیں پہنچائی تھی، جتنا لہو لہان مجھے ان کے پھینکے ہوئے پھولوں نے کیا۔ بھائیوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں، میں تقریباً سات سال بعد واپس لوٹا تھا اور ان سات سالوں میں، میں نے اپنے سب بہن بھائیوں کو اتنا روپا بھیجا تھا کہ وہ سب آج اپنے ذاتی گھروں کے مالک تھے، بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ بھی اپنے گھروں میں خوش تھیں، سبھی کی خواہش تھی کہ میں کم از کم پہلا دن ان کے گھر پر گزاروں، بھابیوں کی جو بہنیں اب رشتے کے قابل تھیں، وہ پوری تیاری کے ساتھ بن ٹھن کر آئی تھیں اور ہر بھابی کی تقریباً یہی خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ میں وہیں اتر پورٹ ہی پر ان میں سے کسی ایک کو پسند کر کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں، حالاں کہ ان مظلوم لڑکیوں کے چہروں پر لکھی بے چارگی کی داستان صاف نظر آرہی تھی کہ وہ خود پر کس قدر جبر کر کے خود کو اس امتحان کے لیے تیار کر پائی ہوں گی۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ مجھے ایک بے حد فوری نوعیت کی کاروباری میننگ کے لیے جانا ہے اور میں موقع ملتے ہی ان سب کی طرف فردافردا حاضری دینے ضرور آؤں گا۔ میرا پاکستانی عملہ، جس کی بھرتی میرے منیجرز نے چند ہفتے قبل ہی کی تھی، حیرت سے کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اتر پورٹ کی پارکنگ لین میں سیاہ مرسلینز گاڑیوں کا فلیٹ میرے استقبال کے لیے موجود تھا اور میں کسی نہ کسی طرح سب کو مطمئن کر کے، یا شاید غیر مطمئن چھوڑ کر اپنے گھر کو روانہ ہوا تو شہر کے راستے اور گلیاں مجھے اُسی طرح خود پر مسکراتے نظر آئے، جیسے میں انہیں سات سال پہلے مسکا تا چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے ہم پر دیس جا کر یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی دیس میں سب کچھ بدل چکا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی سڑکیں، وہی راہیں جن پر میں جانے کتنے سال تک جوتیاں چٹھتا رہا تھا۔ میں شہر کے سب سے قیمتی علاقے میں اپنے نئے گھر پہنچا، تو مجھے ان اجنبی دیواروں سے شناسائی میں کافی وقت لگا۔ بے ظاہر پتھر کے بے جان نظر آنے والے یہ درود یوار بھی اپنے اندر ایک عجیب سا احساس رکھتے ہیں۔ ہم سے خوش یا ناخوش رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر ہم انسانوں کی محدود سماعت ان کی یہ گفتگو سن نہیں پاتی۔ شام کو میرے بلاوے پر کبیر بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ بہت حد تک اپنے بڑے بھائی فیروز سے مشابہت رکھتا تھا۔ گو، عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ کبیر بھی فیروز کے ذکر پر افسردہ ہو گیا، میں نے اسے گھر کی تمام تر ذمے داری سونپ دی۔ وہ شروع ہی میں اتنی بڑی ذمے داری لینے سے کچھ ہچکچا رہا تھا، مگر میرے اصرار پر مان گیا۔ میں نے اسی کو اپنا سکیورٹی انچارج بھی مقرر کر دیا اور شاید اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اسی کام میں راحت محسوس کرتا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنی جیب سے ایک غیر ممنوعہ پستول کا لائسنس نکال کر مجھے دکھایا۔ ”یہ دیکھو صاب۔ ہمارے پاس اسلئے کا لائسنس بھی ہے۔ ہمارے ہوتے آپ کو کسی فکر کا ضرورت

نہیں۔“ میں جانتا تھا کہ کبیر خان سچ کہہ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے لوگوں میں شمار کے لیے آج کل ذاتی محافظوں کی ایک فوج بھی لازمی درکار ہو رہی ہے۔ مجھے بہروز کی ایک نصیحت ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ ”جیسا دلیس ہو، بھیس بھی ویسا ہی ضروری ہے۔۔۔۔۔۔ ورنہ یہ انسان عموماً دوسرے انسان کو کم تر سمجھنے میں دیر نہیں کرتا۔“ اور میں نے پردیس میں اپنی زندگی کے اتنے سال کم تر دکھائی دینے کے لیے ضائع نہیں کیے تھے۔ ہفتے بھر ہی میں سارے شہر کے امراء کو خبر ہو چکی تھی کہ ”پی زیڈ“ نامی کوئی بہت بڑا صنعت کار شہر میں اپنا کاروبار پھیلانے کے لیے وارد ہو چکا ہے۔ ہاں، پی زیڈ۔ یہی نام تجویز کیا تھا میرے منیجرز نے میری نئی کمپنی کے لیے، اور جو مجھے میرے نام سے نہیں جانتے تھے، اب میں ان کے لیے پی زیڈ نامی ایک بڑا انڈسٹریلیسٹ تھا۔ اس طرح مجھے اس تعارفی شرمندگی سے بھی عارضی طور پر نجات مل گئی تھی، جو پورا نام بتانے میں مجھے ہمیشہ اٹھانی پڑتی تھی۔

یہ دولت مند لوگ اندر سے کتنے تنہا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے چند دنوں ہی میں ہو گیا، جب چاروں طرف سے مجھے تعارفی دعوت ناموں نے گھیر لیا۔ یہ شام کی پارٹیاں، رات کی دعوتیں، ظہرانے، عصرانے اور عشائے۔ آخر ان امیروں کو اپنے ارد گرد ہر وقت اتنا ہجوم کیوں چاہیے ہوتا ہے؟ یہ سب اندر سے شدید تنہا ہونے کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے، مگر میں تو ہمیشہ ہی سے ان پُر ہجوم محفلوں سے کتر اتا تھا۔ لوگوں کی تیز چمکتی نظریں، طنز اور طعنوں کا عادی ہو جانے کے باوجود میں اس تجربے کو بار بار نہیں دہرانا چاہتا تھا۔ ہم اپنی زندگی میں بہت سی بے چینیوں اور درد اس لیے بھی پال لیتے ہیں کہ ہمیں حقائق سے نظریں چھرانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میرا اسٹاف منیجر، کمالی بہت تیز اور چلتا پڑھتا قسم کا بندہ تھا۔ وہ شہر میں ہونے والی کسی بھی بڑی تقریب کا دعوت نامہ مجھ تک پہنچانے میں دیر نہیں کرتا تھا، مگر میں ہر بار کسی نہ کسی طور اسے ٹال دیتا تھا۔

اگلے ہفتے سے میں نے سمندر کنارے ایک اعلیٰ ذاتی عمارت میں قائم اپنے دفتر جانا شروع کر دیا۔ ہمارا زیادہ تر کام ابھی تک وہی آفس ہی سے ہوتا آرہا تھا، مگر کمالی نے یہاں بھی خاصا عملہ بھرتی کر لیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر تعارفی مرحلے کی افیت سے گزرنا پڑا۔ ایک بات میں کبھی بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ ان بڑے بڑے غیر متعلقہ دفاتروں میں اتنی بہت سی خواتین کیوں بھرتی کر لی جاتی ہیں۔ جب کہ کچھ کاموں کی نوعیت اس صنفِ نازک کی موجودگی سے بالکل بھی میل نہیں کھاتی۔ جیسا کہ ہماری تعمیراتی کمپنی، جانے کمالی نے اتنے بہت سے اسسٹنٹ اور ڈپٹی منیجر ٹائپ عہدوں پر ان نازک لڑکیوں کو کیوں بھرتی کر لیا۔ میرے استفسار پر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”ساری بات حسِ لطافت کی ہے سر، وہ جسے انگریزی میں Aesthetic Sense کہتے ہیں۔ ویسے بھی ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ جن دفاتر میں خواتین، مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں، وہاں کے مردوں کو زیادہ ذمہ داری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ لباس اور اوقات کار کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں سرجی۔ اور دفتر کا ماحول بھی خوش گوار رہتا ہے۔“ میرا جی چاہا کہ میں کمالی سے پوچھوں کہ اس نے دفاتر اور ان کے طریقہ کار پر ہونے والی سیکڑوں تحقیقات میں سے صرف ایک اسی ریسرچ کو نافذ العمل کیوں سمجھا؟ مگر میں پُپ رہا۔ دفتر میں کام کرنے والی خواتین اور لڑکیاں بھی پہلی بار مجھے دیکھ کر اسی تذبذب کا شکار ہوئیں، جو میرے لیے ہر عورت کا خاصہ رہا تھا۔ مگر میں اس کمپنی کا مالک تھا اور ان کی مجبوری تھی کہ وہ میرے احترام میں کھڑی ہو جائیں اور مجھ سے بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ نہی رہے۔ کمالی نے میرے آنے سے پہلے ہی میرے لیے ایک تیز طراری لیڈی سیکرٹری کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جسے میں نے پہلے دن ہی کسی ڈپٹی منیجر کے سیکشن میں منتقل کر دیا اور کمالی ہی کو اپنا پی اے بھی مقرر کر لیا۔ جانے یہ کمالی کی ترقی تھی یا تنزلی، مگر وہ اس خدمت سے بہت خوش دکھائی دیا۔ کبیر خان میرے ساتھ ہی میری گاڑی میں دفتر آتا اور میری روانگی تک عمارت کے کسی گوشے میں یا بارگازڈی ہی میں میرا انتظار کرتا رہتا، مگر نہ جانے کیوں کمالی کی اس سے جان جاتی تھی۔ کمالی کئی بار مجھ سے دبے لفظوں میں یہ گزارش کر چکا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ دفتر کے اندر تک نہ لایا کروں، کیوں کہ بقول اس کے، کبیر خان کا انداز ہی بڑا خوف ناک تھا۔ اور خود کبیر خان کے بھی کمالی کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں تھے۔ ”ہم کو یہ آدمی کچھ ٹھیک نہیں لگتا صاب۔ یہ بڑا چالپوس ہے اور خوشامدی لوگ اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ دونوں میرے لحاظ کی وجہ سے ایک دوسرے کو برداشت کرتے آرہے تھے۔ میں نے کبیر خان کو سمجھایا کہ یہ دنیا چلتی ہی خوشامد پر ہے۔ صدر سے لے کر کلرک تک سب کسی نہ کسی خوشامدی وجہ سے اپنی جگہ اور عہدے پر قائم ہیں۔ خوشامد شاید دنیا کا سب سے قدیم ہتھیار ہے، جس کی دھار کسی بھی دور میں کند نہیں ہوتی۔

کچھ دن اسی ہنگامہ خیزی کی نذر ہو گئے، مگر جیسے ہی کاروباری معاملات اپنی ڈگر پر آئے، میں نے ڈرائیور کو گاڑی نکال کر، اسے شہر کے وسط میں واقع ایک گنجان علاقے میں چلنے کے لیے کہا۔ تنگ سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم گھنٹہ بھر بعد ایک گھلے میدان میں آ نکلے۔ سامنے ابھی تک وہی پرانا ٹین کا بڑا سا نصف گولائی میں کٹا بورڈ گیٹ پر آویزاں تھا، ”مستانہ گیراج“ میری آنکھوں کے سامنے ماضی کے کئی دن، پل بھر میں ابھرا گئے۔ ڈرائیور کو میں نے گاڑی گیراج کے احاطے میں لے جانے کو کہا۔ اس نے دبے لفظوں میں مجھے بتانے کی کوشش کی کہ کمپنی کی گاڑیوں کے لیے اپنا مخصوص ڈیپارٹر اور گیراج شہر کے پوش علاقے میں موجود ہے، مگر میں نے سنی ان سنی کر دی۔ گیراج کے برآمدے میں لکڑی کے ستون کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر وہی پرانا ساریڈیولر کا ہوا تھا اور فضا استاد مستانے کے من بھاتے گانوں کی آواز سے گونج رہی تھی ”جو درد دیا، اپنوں نے دیا، غیروں سے شکایت کون کرے۔۔۔۔۔۔“ گاڑی اندر داخل ہوتے دیکھ کر ایک شاگرد بھاگتا ہوا ہماری کار کی طرف آیا۔ ”جی صاحب۔۔۔۔۔۔ حکم کریں، سروس کرنی ہے یا آئل بدلوانا ہے۔ ٹیوننگ بھی ہو جائے گی، پر آپ کی گاڑی کا انجن سیل بند ہے۔ کچھ وقت لگے گا ہماری ورک شاپ پر۔۔۔۔۔۔“ یہ کوئی نیا لڑکا تھا۔ کچھ دُور باقی لڑکے ویلڈنگ پلانٹ پر اسی طرح ویلڈنگ میں جُتے ہوئے تھے، جیسے کبھی میں وہاں سارا دن بیٹھ کر اپنا خون ویلڈنگ کی چنگاریوں میں جلایا کرتا تھا۔ میں نے لڑکے سے سختی سے کہا ”تمہارا استاد کہاں ہے؟ اس نے ہماری گاڑیوں کا ستیاناس کر دیا ہے، ٹھیک سے کام نہیں آتا اُسے، جاؤ، بلا کر لاؤ۔“ شاگرد گھبرا کر اندر کی جانب بھاگا اور چند لمحوں بعد استاد کی غصے میں بھری آواز سنائی دی۔ ”ارے کون سا بیٹھ ہے میاں! ہم بھی تو دیکھیں، استاد مستانے نے آج تک اپنے کام میں ہیرا پھیری نہیں کی۔ ہم محنت کرتے ہیں، چوری نہیں کرتے۔“ استاد مستانہ اپنے مخصوص حلیے میں سر پر دوپٹی ٹوپی رکھے، واسٹ پہنے اور منہ میں پان دبائے بڑبڑاتا ہوا برآمدے سے نکل کر گیراج کے صحن میں آیا اور ہماری گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے ڈرائیور اور کبیر کو گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہنے کو کہا اور خود نیچے اتر آیا۔ میری آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا، جسے میں نے اتار کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ استاد بے خیالی میں غصے میں بھرا میری طرف بڑھا۔ میں منہ دوسری جانب موڑ کر کھڑا ہو گیا اور غصے سے بولا۔ ”کیوں استاد مستانے۔۔۔۔۔۔ یہ گیراج ہے یا ہیرا پھیری کا ڈاکٹر؟“ مستانے کے سارے شاگرد برآمدے میں دم بخود کھڑے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب ان کا بھڑکیلا استاد سب کچھ بھول کر مجھ پر پل پڑے۔ میرے تیور دیکھ کر کبیر خان کا ہاتھ ہولسر میں بندھے پستل کی جانب بڑھ گیا۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، نلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت روتوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

استاد متانے کے شاگردوں نے بھی اپنے طور پر آس پاس پڑے اوزار بطور ہتھیار اٹھا لیے، کیوں کہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اُن کا استاد کیلا ہی ہم سے بھڑ جائے گا۔ تجھی میں نے پلٹ کر پھرے ہوئے استاد متانے کی طرف دیکھا۔ ”کم از کم یہ سات سو سال پرانا ریڈیو تو بدل لیتے استاد..... اب تو اس کے اردو گانے بھی چائینیز میں سنائی دیتے ہیں۔“ استاد کا منہ گھلے کا گھلارہ گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ اپنی جگہ جامد ہو گیا اور پھر اس کی آنکھوں سے ایک جھڑی سی جاری ہو گئی اور دوڑ کر روتے ہوئے میرے گلے لگ گیا۔ ”او بے وفا.....! اتنے دن بعد اپنے استاد کی یاد آئی۔ مجھے رفیق نے فون کر کے بتایا تھا کہ تم واپس آ چکے ہو۔“ سارا گیراج ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا اور پھر چند پرانے شاگردوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور ہمارے گرد ایک جھگھسا سا لگ گیا۔ استاد نے بڑی مشکل سے انہیں ڈانٹ کر کام پر لگایا، مگر وہ سب بہانے بہانے سے میری کار کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ وہ سب جان چکے تھے کہ کل تک میں بھی انہی میں سے ایک تھا، مگر آج اُن کے سامنے ان کے خوابوں کی تعبیر بنا کھڑا تھا۔ ہم کم زور اور بے بس انسان جنم سے لے کر فنا تک یہی تو کرتے رہتے ہیں، اپنے خوابوں کا چھپا، ان خوابوں کو بچ کرنے کی دھن میں مگن..... مگر ہر ایک کے حصے میں تعبیریں بھلا کب آتی ہیں اور گیراج کے معصوم لڑکے یہ بات نہیں جانتے تھے کہ میں آج جو کچھ تھا، یہ کبھی میرا خواب نہیں رہا تھا۔ میں نے تو بہت چھوٹا سا سپنا بنا تھا۔ بہت معصوم سا خواب تھا میرا، مگر اس کی تعبیر کے لیے جانے مجھے ابھی کتنے طویل رستوں سے گزرنا باقی تھا کہ منزل ابھی تک لاپتا تھی۔ شاید ہر انسان ہی کا مقدر، اپنے خوابوں کو کسی اور کے لیے تعبیر ہوتے دیکھنا ہوتا ہے اور اس کا اپنا خواب سدا کے لیے خواب ہی رہ جاتا ہے۔

استاد متانے نے نکل کے ہوٹل سے میری پسندیدہ دودھ دہتی چائے منگوائی اور خود میرے سامنے بیٹھ کر ٹکڑ ٹکڑ مجھے دیکھنے لگا۔ ”تم نے تو واقعی کر دکھایا پیارے، ورنہ میرا تو کرامات سے یقین ہی اٹھ چلا تھا۔ جو تم نے چاہا، تمہیں مل گیا۔ ایسا دنیا میں کہاں ہوتا ہے بھلا۔“ میں نے مسکرا کر استاد کی طرف دیکھا۔ ”صرف تھوڑی سی دولت آگئی ہے، میرے پاس باقی کچھ نہیں بدلا استاد..... میں ابھی تک وہی پری زاد ہوں۔“ استاد نے پینتر ابدل کر کہا۔ ”کمال کرتے ہو تم، دولت سے بڑی تبدیلی بھی کوئی اور ہوتی ہے کیا.....؟ لوگوں کی زندگیاں صرف ہو جاتی ہیں چند دھیلے کمانے میں۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو، سدا کے کنگال ہی رہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کوئی شادی وادی بھی کی ہے یا نہیں، یا ابھی تک وہی شرمیلے، کنوارے پری زاد ہو؟“ میں نے مزے دار چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ ”مجھ سے بھلا کون شادی کرے گی استاد، اور پھر شاگرد بیاہ کر لے اور اس کا استاد کنوارا رہے، یہ کہاں کا دستور ہے؟“ استاد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”کیوں اس عمر میں میری لٹیا ڈبونے کی بات کرتے ہو پری زاد پیارے، اور یہ کیا بات کر دی کہ تم سے کون بیاہ کرے گی، ذرا اعلان تو کر کے دیکھو نکاح کا، پورا سوئمبرر چپے گا تمہارا تو.....“ میں نے استاد کی بات دوسری جانب موڑ دی۔ ”میری شادی کی بات چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ گیراج کا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ لگتا ہے برسوں سے رنگ و روغن نہیں کروایا۔ کام والی گاڑیاں بھی اکا دکا کھڑی نظر آ رہی ہیں، صحن میں۔ یہ سب کیا ہے.....؟“ استاد نے میری بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”کچھ نہیں دھندے میں تو بھلا مندا چلتا ہی رہتا ہے، تم ساؤ کیسی گزر رہی ہے؟“ اتنے میں چائے کے برتن اٹھانے والے لڑکے نے ہماری بات سن کر راز کھول ہی دیا۔ ”پری زاد بھائی! گیراج تو گروی پڑا ہے ہمارا تین سال سے۔ استاد غلط بتا رہا ہے، کوئی دھند نہیں، صرف مندا ہی مندا ہے آج کل یہاں۔“ استاد نے آنکھیں دکھاتے ہوئے اسے بُری طرح سے جھاڑ پلائی۔ ”کم بخت! تُو باز نہیں آئے گا بڑوں کی باتوں میں دخل دینے سے، چل دفع ہو، جا کر اس اٹھتر بیاسی کروالا کے ڈینٹ نکال۔ شام تک مجھے گاڑی تیار چاہیے، ورنہ کھال ادھیر دوں گا تیری۔“ لڑکا منہ بسورتا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ ”یہ میں کیسا سن رہا ہوں استاد! گیراج گروی پڑا ہے، کیوں.....؟“ استاد نے ایک لمبی سانس بھری۔ ”اب کیا بتاؤں پری زاد! پرانے میکینک اور گیراجوں کا کام ٹھپ ہو چکا ہے۔ گاڑیوں کے انجن اب سیل بند آتے ہیں۔ ٹیوننگ اور مرمت کمپیوٹر والی مشینوں پر ہوتی ہے۔ ٹائر ہٹاؤ بک کے آگئے ہیں اور خرا دکا کام اب ماڈرن مشین کرتی ہے۔ ہمارے پاس تو وہی چند پرانی کھٹارا گاڑیاں آتی ہیں، جن کا مزاج یہ نئی مشینیں سمجھ نہیں سکتیں۔ خرچے تمہارے سامنے ہی تھے سارے۔ ایسے میں گیراج گروی نہ رکھتا تو کیا کرتا۔ مجھے اپنی فکر نہیں، بس یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں کہ گیراج کی قرقی یا نیلائی کے بعد نیا مالک کہیں ان بچوں کو بے روزگار نہ کر دے۔ تم تو جانتے ہو، ان سب کے گھر، ان ہی کے دم سے چلتے ہیں۔ کئی دفعہ ان سے کہا کہ کم بختو، جاؤ جا کر کوئی نیا دھندا ڈھونڈو..... پر، یہ ہیں کہ یہاں سے تلنے ہی نہیں۔“ میں پُپ چاپ بیٹھا استاد کی ساری بات سُنتا رہا۔ ”کس کے پاس گروی رکھا ہے یہ گیراج تم نے.....؟“ استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ اسی علاقے کا ایک مارواڑی سیٹھ، بھلا آدمی ہے۔ قرقی کی تاریخ سے پہلے ٹھگ نہیں کرے گا۔“ مجھے اس سیٹھ کا نام اور مکمل پتا چاہیے استاد۔“ استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں پیارے! استاد اپنے شاگردوں کو دینا ضرور لیتا کچھ نہیں۔“ میں نے استاد سے زیادہ بحث نہیں کی اور کمائی کو فون کر کے گیراج پہنچنے کو کہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ہڑ بڑایا سا گیراج میں موجود تھا۔ میں نے گیراج کے سب سے سینئر شاگرد کو کمائی اور ڈرائیور کے ساتھ سیٹھ کی طرف بھجوا دیا، جس کا پتا گیراج کے کبھی لڑکے جانتے تھے۔ تین گھنٹے بعد ہی کمائی رہن رکھے گئے کاغذات کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ ”میں نے جائداد کی آزادی کے کاغذ استاد کی جھولی میں ڈال دیے۔“ یہ گیراج جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی میرا بھی ہے استاد۔ اگلے ہفتے تک نئی کمپیوٹر انڈمشینری بھی آجائے گی اور تمہاری یہ ڈیوٹی ہے کہ اپنی مگرانی میں میرے اس گیراج کو ایک دم ٹپ ٹاپ بنادو۔ اگلی دفعہ جب میں اپنے گیراج کو دیکھنے آؤں، تو مجھے یہاں میرا پرانا استاد متانہ چاہیے۔ ہاں، مگر یہ ریڈیو نہ بدلا۔ اس کے پتا یہ گیراج مکمل نہیں ہوگا۔“ استاد متانہ گم صم سا ہاتھوں میں قرقی کھلنے کے کاغذات لیے بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے نڑا۔ استاد نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ ”پری زاد.....“ میں نے مُڑ کر دیکھا تو وہ میرے گلے لگ گیا۔ میرے آس پاس گیراج کے سارے لڑکے جمع

ہو چکے تھے، کسی نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے، تو کوئی میرے شانے سے لگا کھڑا تھا۔ یہ کم بخت، بے جان اور کھر درے کاغذ کے چند روپے اپنے اندر لٹنی خوشیوں پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔ کیسے کیسے کرتے، کرشمے دکھاتا ہے یہ پیسا۔ روتوں کو ہنسا دیتا ہے اور ہنستوں سے چمکڑ کر انہیں آٹھ آٹھ آنسو لاتا ہے، اور یہ دولت مند کتنے ان جان رہتے ہیں، اس پیسے کے استعمال سے۔ کاش! ان بے جان کاغذ کے ٹکڑوں کا صرف ایک مصرف ہوتا، خوشیوں کا کاروبار۔ ان لڑکوں کے چہروں پر ایسی خوشی تھی کہ جس کے بدلے ساری دنیا کی دولت بھی لٹا دی جاتی تو کوئی گھائے کا سودا نہ ہوتا، مگر عموماً قدرت جنہیں دولت دیتی ہے، بدلے میں ان کا دل نکال لے جاتی ہے، شاید اسی لیے یہ دنیا دل والوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

گیراج سے نکلتے نکلتے سہ پہر کے چار بج گئے۔ دفتر جانے کا وقت تو رہا نہیں تھا، میں نے ڈرائیور کو گاڑی گھر کی طرف موڑنے کا کہہ دیا اور پھر واپسی پر میری نظر اپنی پرانی یونیورسٹی کے بورڈ پر پڑی۔ میں نے گاڑی رکوا دی اور کچھ دیر کے لیے نیچے اتر کر گیٹ سے اندر چلا گیا۔ اس درس گاہ میں، میں نے اپنی زندگی کے چند اچھے دن گزارے تھے، اچانک ہی میرے اندر خود میرے ہی ہاتھوں دفنایا ہوا، وہ ایک ناکام سا شاعر جاگ اٹھا، جس کے کلام پر داد و تحسین سے کبھی وہ سامنے نظر آنے والا بڑا آڈیٹوریم گونج اٹھتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہی جاتے وقت میں اپنی ساری نظمیں اور کلام ٹیٹن کے ایک کبے میں بند کر کے اپنے پرانے گھر کے چھت والے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ جانے اب وہ سارے رجسٹر اور کاغذوں کے دستے کہاں ہوں گے۔ کاش! میں وہ سب اپنے ساتھ ہی دئی لے جاتا۔ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ میرے عقب میں ایک مانوس سی بھاری آواز گونجی۔ ”تم پڑی زاد ہوناں.....“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے عقب میں کھڑی میری گاڑی سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ شیروانی اور جناح ٹوپی پہنے کھڑے مجھے اپنی نظر کے چشمے کے پیچھے سے ٹھٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ ”جی..... میں پڑی زاد ہوں..... مگر آپ.....؟“ وہ میری طرف بڑھے۔ ”بھول گئے، یادداشت کی کم زوری تو بڑھا پے سے مشروط ہوتی ہے، مگر میں نے تو تمہیں پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا۔“ میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ”مجھے پہچاننے کے لیے شاید یادداشت شرط نہ ہو۔ آپ شاید سراج احمد ہیں، ہمارے لائبریری انچارج؟؟“ وہ مسکرائے۔ ”ٹھیک پہچانا۔ تمہارے جانے کے بعد اردو بزم ادب کا شعبہ بھی میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ تمہاری کبھی ہوئی نظمیں آج تک جامعہ کے ادبی پرچے میں چھپتی رہتی ہیں اور تمہاری وہ اسٹیج ڈرامے والی نظم ”گر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....“ ہر سال جب بھی اوتھیلو اسٹیج کیا جاتا ہے، پس منظر میں تمہاری وہ نظم ضرور دہرائی جاتی ہے۔“ میں خاموشی سے احمد صاحب کی بات سننا رہا۔ میرا دل چاہا کہ انہیں بتا دوں کہ میں وہ شاعری بھی کسی خاص مقصد سے کیا کرتا تھا۔ کالج کی چند مہجینوں میں اک ذرا سی توجہ حاصل کرنا مقصد تھا میرا، اور بس..... انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، تم اچانک یونیورسٹی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے، تعلیم مکمل کی یا نہیں؟“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”کچھ مجبوریاں تھیں سر، مجھے دئی جانا پڑا۔“ سراج احمد نے پلٹ کر میری قیمتی گاڑی اور گارڈز کی طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے، تم نے وقت ضائع نہیں کیا وہاں، لیکن تم یہاں باہر لان میں کیوں کھڑے ہو، اندر چلو۔ بہت سے طالب علم تم سے ملنا چاہیں گے۔ شعبہ اردو میں اکثر تمہاری نظموں پر بات چلتی ہے۔“ میں نے طریقے سے معذرت کی۔ ”نہیں سر..... آج نہیں، یہ میرا کارڈ ہے۔ کبھی فرصت ملے تو میرے دفتر چکر لگائیے گا۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

یونیورسٹی سے گھر واپس آنے کے بعد بھی، میں بہت دیر تک یونیورسٹی کی یادوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا۔ مجھے وہ نٹ کھٹ سی لہنی بھی یاد آئی۔ جانے اب وہ کہاں ہوگی۔ سینٹھ عابد سے شادی کے بعد کبھی اس کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا تھا۔ لہنی کی ماں کے ایک جملے نے میری زندگی کے تمام راستے بدل دیئے تھے، مگر میں دولت کمانے کی دھن میں ایسا لگن ہوا کہ اپنے اندر بسنے والے اُس حساس اور نازک انسان کو بھی کچل کر رکھ دیا، جو کبھی میرا سب سے اچھا دوست تھا، لیکن اس ساری تنگ دود سے مجھے کیا ملا۔ میں تو آج بھی اتنا ہی تنہا اور اکیلا تھا، نہ کسی کے حرف دعا میں تھا، نہ کسی کے دست طلب میں..... نہ کسی کی آنکھ کا نور تھا، نہ کسی کے دل کا قرار..... مجھے میسر نہیں ہو چکی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل کر شام کو رات کی سیاہ چادر میں لپیٹ رہا تھا۔ لوگ دن اور رات کو ایک دوسرے کی ضد کہتے ہیں، مگر مجھے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی لگتے تھے، پکے دوست..... تبھی تو جب دن شدید تھکن سے پھر ہو کر شام تک ہانپنے لگتا ہے، تب شام اپنی مہربان سہیلی، رات کو آواز دے کر بلاتی ہے اور رات اپنی کالی شال میں اس تھکے ماندھے دن کو سمیٹ کر سلاہتی ہے۔ یوں شاید ہر رات کی گود میں ایک بھر پور دن آنکھیں موندے سویا رہتا ہے، بس ہمیں ہی نظر نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے آکر بتایا کہ کمالی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کمالی میسر پر آیا تو معمول سے کچھ زیادہ ہلکھل لباس میں ملبوس تھا۔ ”یہ کیا سر.....؟ آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے، ہمیں سیٹھ رحمان کے فارم

ہاؤس جانا ہے، پارٹی میں۔ شام سے تین مرتبہ وہ خود مجھے یاد دہانی کروا چکے ہیں کہ یہ دعوت خاص طور پر آپ کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔“ میں نے جان ٹھہرانے کی کوشش کی۔ ”میرا موڈ نہیں ہے کمالی، تم میری طرف سے کوئی مناسب معذرت پیش کر دینا.....“ کمالی گڑبڑا سا گیا۔ ”نہیں سر! اچھا نہیں لگے گا، سارے شہر کے امراء وہاں اکٹھے ہوں گے اور پھر ہمیں وہاں، اپنے نئے ٹینڈرز کے امیدواروں سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ نیا نیا کاروبار ہے اپنا سر۔ یہ میل جول رکھنا ضروری ہے۔“ میں نے بادلِ نخواستہ خود کو بڑی مشکل سے آمادہ کیا اور گھٹنے بھر بعد ہم سیٹھ رحمان کے فارم ہاؤس کی راہ پر گام زن تھے۔

آج کل امیروں کا یہ ایک نیا مشغلہ بننا جا رہا ہے۔ شہر میں ٹھیک ٹھاک عالی شان گھریا جائے گا اور ہونے کے باوجود، کسی دیرانے میں سیکڑوں ایکڑ اراضی پر ایک فارم ہاؤس تعمیر کیا جاتا ہے، جہاں ایسی ہی کاروباری اور غیر رسمی دعوتیں رکھی جاتی ہیں۔ یہ فارم ہاؤسز ایک طرح سے امراء کا انٹینس سہیل بھی ہوتے ہیں اور کچھ خاص لوگوں کے لیے پردے کا کام بھی کرتے ہیں۔ سیٹھ رحمان کا فارم ہاؤس بھی کچھ ایسا ہی پردہ محسوس ہوتا تھا۔ کئی ایکڑ گھاس کے میدان اور گالف کورس کے درمیان بنی شیشے کی عمارت، جس کے آس پاس مصنوعی نہر اور فواروں کے ذریعے پانی کے بہاؤ کا انتظام موجود تھا۔ انسان مادی طور پر چاہے جتنی بھی ترقی کر لے۔ پانی اور سبزہ اس کی جہت سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ ہمارے ذہنوں میں جہت کا تصور بھی تو بہت نہروں، ٹھنڈے چشموں اور گھٹنے

سایوں ہی کی صورت نقش ہے۔ سارا فارم ہاؤس برقی قیموں سے جگمگا رہا تھا، بارانی کیو کا بندوبست بھی باہر سبزے ہی میں کیا گیا تھا۔ میں وہاں موجود لوگوں سے صرف نام کی حد تک ہی واقف تھا، مگر لگتا تھا کہ کمالی نے میرا کافی تفصیلی تعارف کروایا تھا۔ تبھی وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میری کمپنی اگلے نصف ایک بہت بڑا آرڈر ٹینڈر کرنے والی تھی۔ معیاری آلات کی فراہمی اور ایک نئی جدید ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے ہمیں بہت بڑی مالیت کا ٹھیکہ دینا تھا اور وہاں پارٹی میں موجود کبھی کاروباری طبقے اس ٹھیکے میں دل چسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ سیٹھ رحمان پچاس پچپن سالہ

ایک گھاگ اور شوقین مزاج شخص تھا، جسے باتیں بنانے کے فن سے کافی آگاہی تھی۔ اس نے فردا فردا سبھی مہمانوں سے میرا تعارف کروایا اور وقتاً فوقتاً اپنی گفتگو کے دوران مجھے یہ بتانے میں قطعاً عار محسوس نہیں کی کہ وہ ہماری کمپنی کے ٹھیکے میں کافی دل چسپی رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کمالی جس طرح سیٹھ رحمان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا، اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کمالی کو بھی خوش کر رکھا ہے۔ ”کیا بتاؤں سرجی..... یہ اپنے رحمان صاحب تو یاروں کے یار ہیں، بڑا اہلکار رہتا ہے، ان کے فارم ہاؤس پر۔ صوبائی اور وفاقی وزراء اور نوکر شاہی تو سمجھیں کہ بس ان ہی کی دل دادہ ہے، آج بھی جو کافی فخرزاد اور سیکرٹریز آپ کو اس دعوت میں نظر آ رہے ہیں، یہ ان ہی کا کمال ہے۔ سبھی کو خوش رکھنے کا فن تو کوئی رحمان صاحب سے سیکھے۔“ کمالی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ اس محفل میں مجھے ایک اور ادراک ہوا۔ اخلاقیات اور شرم و حیا کے معیارات ہر طبقے میں اپنے اپنے طور پر طے اور رائج شدہ ہوتے ہیں۔ محفل میں زرق برق اور جھلمل کر تے ملبوسات میں خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو اس آزادانہ ماحول میں یہاں وہاں اٹھلاتی پھر رہی تھیں اور ان میں زیادہ تر وہ تھیں، جو کسی نہ کسی بڑے آدمی کے ساتھ بطور ”دوست“ اس محفل میں شریک تھیں۔ تعارف کے دوران ان میں سے اکثر نے مجھ سے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ کبھی مشرقی اقدار میں زنانے اور مردانے کا رواج ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی محفلوں اور دعوتوں میں مرد اور خواتین الگ الگ حصوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ دولت کی فراوانی کا ان بدلتی قدروں سے کوئی تعلق نہیں تھا، کیوں کہ دولت اور پیسا تو ان کے پاس آج کے ان دولت مندوں سے کہیں زیادہ تھا، تو پھر یہ آزاد خیالی اور بے جہانی ہمارے معاشرے میں کہاں سے ڈر آئی۔ چوں کہ انسان کی ابتدا پتھر کے دور سے ہوئی تھی، تو شاید اس کا اختتام بھی پتھر کے دور ہی پر ہوگا۔ درمیانی مدت مکمل عروج اور پھر یک سر زوال کا محض ایک دورانیہ ہی تو ہے، کھانے سے پہلے ہر طرح کے غیر ممنوعہ اور ممنوعہ مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ انسان خدا سے ہمیشہ عقل اور ہوش مندی کا طلب گار رہتا ہے تاکہ زندگی متوازن اور خوش گوار گزار سکے، مگر شام ہوتے ہی ہم میں سے اکثر اس ہوش مندی سے گھبرا کر خود کو مدہوشی کے اندھیرے کنوئیں میں کیوں اتار لیتے ہیں، مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ میرے ارد گرد مصنوعی مدہوشی کا دور دورہ تھا، عارضی اور جھوٹی بے خودی۔

میں نے اکتا کر کمالی کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے لپک کر میرے قریب آیا۔ ”اتنی جلدی سر..... کھانا بس لگنے ہی والا ہے۔ سیٹھ رحمان کو کسی خاص مہمان کا انتظار ہے۔ ان کے آتے ہی کھانا چن دیا جائے گا۔“ میں نے اکتاہٹ سے کمالی کی طرف دیکھا۔ ”ہماری حاضری لگ گئی ہے، تم اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔“ کمالی نے سر ہلایا اور سیٹھ رحمان کو روانگی سے مطلع کرنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے ابھی کار پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی جانب سے رحمان، کمالی کے ساتھ تیز اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا نمودار ہوا۔ ”یہ کیا پی، زید صاحب! آپ ابھی سے چل دیئے۔ ابھی تو شام اور محفل ٹھیک طرح سے بھیگی بھی نہیں.....“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ ”میں شام دیر تک اس میں بیٹھتا رہوں، تو مجھے زکام ہو جاتا ہے۔ بھیگنے کے معاملے میں کم ظرف واقع ہوا ہوں میں۔“ سیٹھ میری بات سن کر زوردار قہقہہ لگا کے ہنسا۔ ”خوب..... بہت خوب.....“ بھیجی میں تو سمجھتا تھا کہ پورے شہر میں، صرف ایک میں ہی بذلہ سنج باقی بچا ہوں، مگر آج اپنا مقابل دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اب تو میں آپ کو ہرگز اتنی جلدی واپس نہیں جانے دوں گا، محفل کے بعد بیٹھ کر آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ برسوں بعد کسی ہم زاد سے واسطہ پڑا ہے۔“ میں نے بہت جان بچھڑانے کی کوشش کی کہ ”کل ایک اہم پروجیکٹ کے لیے میٹنگ کی تیاری کرنی ہے، مگر سیٹھ رحمان اڑ گیا۔“ نہیں بھیجی، ابھی تو آپ کو اس محفل کی جان سے ملوانا ہے، شہ پارہ بیگم..... چوٹی کی ایکسٹریس ہیں..... بڑی دھوم مچائی ہے انہوں نے فلم انڈسٹری میں۔ ویسے تو وہ کبھی کسی پبلک پلیس پر یوں آتی جاتی نہیں، مگر ہمارے ساتھ کچھ دیرینہ مراسم کا خیال ہے انہیں، اسی لیے آ رہی ہیں۔ یہ لیس، شاید یہ ان ہی کی گاڑی ہے، وہ آگئیں، آپ بس دو لمحے انتظار کریں۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے اُن سے..... وہ خود بھی بہت مشتاق تھیں آپ سے ملنے کی۔ سچ پوچھیں تو وہ صرف آپ سے ملنے ہی آ رہی ہیں۔“ سیٹھ رحمان جلدی سے آگے بڑھ گیا اور میرا سوال میرے من ہی میں چل کر رہ گیا کہ وہ بھلا مجھے جانتا ہی کتنا تھا کہ اسے میری تعریف کی ضرورت پڑ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سیٹھ رحمان ایک زرق برق، ناز وادا کے پیکر کو لیے میری طرف آنا نظر آیا۔ میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر ساتھ چلتی عورت پر پڑی تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اس عورت کو جانتا تھا، مگر تب اس کا نام شہ پارہ نہیں تھا۔ شہ پارہ کی نظر میری نظر سے ٹکرائی، تو وہ بھی ایک جھٹکے سے ٹھٹھک کر وہیں جم گئی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، منکک کے معروف و منفرد ڈراما نویس، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گدازی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janguogroup.com.pk

سیٹھ رحمان کے ساتھ آنے والی عورت لیتی تھی۔ ہاں وہی میری یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت اور طرح دار لیتی، جس کی شادی سیٹھ عابد نامی ایک دولت مند کھاڑیے سے ہو گئی تھی، سیٹھ رحمان ہم دونوں کی کیفیت سے بے خبر ہمارا تعارف کروانے میں مصروف تھا۔ ”شہہ پارہ بیگم! ان سے ملیں، یہی ہیں، پی زیڈ صاحب اور؟“ ج کل شہر میں بس انہی کے چرچے ہیں اور یہ ہیں شہہ پارہ... ہمارے ملک کی نام ور آرٹسٹ، پڑوسی ملک میں بھی اپنی اداکاری سے دھوم مچا چکی ہیں۔ آج ہم نے خاص؟ پ سے ملاقات کے لیے انہیں مدعو کیا ہے۔“ لیتی چپ چاپ کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ ”ہماری پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے رحمان صاحب، مگر تب یہ پی زیڈ نہیں تھے اور نہ میں شہہ پارہ۔“ سیٹھ رحمان کو شہہ پارہ کی بات سن کی حیرت کا ایک جھٹکا لگا ”ارے... واقعی...“ بھئی پی۔ زیڈ صاحب، آپ تو واقعی مجھے رستم نکلے، جب کہ ہم یہ سمجھتے رہے کہ اس گوہر نایاب سے دوستی کا شرف ہمیں ہی حاصل ہے۔“ لیتی عرف شہہ پارہ نے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھے بغیر کہا ”ہمیں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیجیے رحمان صاحب... پڑانے پھڑے ہوئے ملیں، تو کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے دونوں کے درمیان۔“ سیٹھ رحمان لیتی کی بات سن کر ہڑبڑاکے بولا ”ہاں ہاں، کیوں نہیں، آپ لوگ باتیں کریں، میں کھانا لگوانے کا انتظام کرتا ہوں۔“ سیٹھ رحمان جاتے جاتے بھی ہمیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ لیتی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے قریب آگئی، ”پری زاد... یہ تمہی ہوناں! مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا، تو تم ہوشہر کے وہ ننھے بگ شاٹ، بڑے صنعت کار، میرا تعلق اب فلم انڈسٹری سے ضرور ہے، مگر ایسا میں نے صرف فلموں ہی میں ہوتے دیکھا ہے۔ تم واقعی ایک فاتح ہو پری زاد...“ میں نے لیتی کی طرف دیکھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی خوب صورت اور جاذب نظر تھی، بلکہ اس کے حسن میں اب اداسی کی آمیزش نے ایک عجیب سا رنگ بھر دیا تھا۔ حسن اداس ہو تو کتنا مکمل ہو جاتا ہے۔ ”نہیں، میں کبھی فاتح نہیں رہا، بس ہارتا ہی آیا ہوں، مگر تم اور یہ شہہ پارہ، یہ سب کیا ہے، تمہارا شو ہر کہاں ہے، وہ سیٹھ عابد...؟“ لیتی دھیمے سے مسکائی ”سیٹھ عابد ایک کامیاب سوداگر تھا۔ اسے جب تک شادی کے سودے میں اپنا فائدہ نظر آیا، اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا اور جب سود سمیت سارا منافع وصول ہو گیا، تو تین لفظ کہہ کر آزاد کر دیا۔ تم نہیں جانتے پری زاد، اسے سودے بازی خوب آتی تھی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسا سودے باز تھا۔“ لیتی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”اوہ! اس کا مطلب میرا شک صحیح تھا۔ اس نے تم سے بھی تمہاری شاعری کا سودا کیا تھا ناں، مجھے ہمیشہ اس کے نام سے ٹھہری اس کتاب کے لفظوں میں تمہاری جھلک نظر آتی تھی، مگر میں خود کو کبھی یہ یقین نہیں دلا پائی کہ تم اپنے فن کو سیٹھ عابد جیسے کسی دکان دار کے ہاتھ بیچ سکتے ہو؟“ میں نے لیتی کی سیاہ غزالی آنکھوں میں مجھے سوال کا جواب دیا۔ ”ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ سیٹھ عابد ایک بہت کامیاب سوداگر تھا۔ اُسے ٹھیک وقت پر اپنے مطلب اور لوگوں کی مجبوریوں کی قیمت لگانا خوب آتا تھا، بیچ پوچھو تو آج جو تم مجھے پری زاد سے پی زیڈ صاحب بنا دیکھ رہی ہو، اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں سیٹھ عابد سے کیے ہوئے اس سودے کا بھی ہاتھ ہے۔ مگر تم یہاں اس محفل میں کیسے، یہ سیٹھ رحمان تو بڑا کایاں شخص دکھائی دیتا ہے، اور تم اس کی خاص مہمان ہو، یہ سب کیا ہے؟“ لیتی نے ذور کھڑے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھا، جو مہمانوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ ”یہ سیٹھ بھی ایک کامیاب دکان دار ہے، اس نے مجھے تمہیں رجھانے کے لیے؟ ج یہاں مدعو کیا ہے۔ تمہاری فرم سے کوئی ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب میرا مصرف ان بڑے صنعت کاروں کے ہاں بس اتنا ہی رہ گیا ہے۔“ میں نے دکھ سے لیتی کی طرف طرف دیکھا۔ ”اور فرض کرو تم مجھے رجھانے میں ناکام رہتیں، پھر... پھر کیا ہوتا؟“ ”کچھ زیادہ نہیں، میری بچی کچی عزت نفس کو مجروح کیا جاتا اور پھر کسی اور سودے کے لیے پیش کر دیا جاتا، کیوں کہ میری ماں دنیا سے جاتے جاتے اتنے ادھار میری ذات کے لیے چھوڑ گئی ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو ان زنجیروں سے خود کو آزاد نہیں کر سکتی۔“ اتنے میں سیٹھ رحمان ہمارے قریب پہنچ گیا۔ ”نخل ہونے کی معذرت چاہتا ہوں، مگر کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ باتوں کے لیے تو ساری رات پڑی ہے، اور پھر مجھے تو لگتا ہے کہ شہہ پارہ بیگم ہم سے کہیں زیادہ آپ کی باتوں کی قدر دان ہیں، ورنہ اتنی لمبی گفتگو تو یہ کسی سے نہیں کرتیں۔ ہم تو بات کرنے کو ترس جاتے ہیں صاحب...“ میں نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ ”نہیں سیٹھ صاحب! اب میں چلوں گا،؟ پ کا کھانا شاید مجھ سے ہضم نہ ہو سکے۔ کل؟ پ اپنے مینیجر کو میرے دفتر بھیج دیجیے گا۔ یہ ٹھیکہ آپ ہی کو ملے گا اور یہ کیا، اس جیسے مزید جتنے سودے آپ کرنا چاہیں، میری طرف سے ہاں ہی سمجھیے گا۔ بدلے میں مجھے صرف کسی کی؟ زادی درکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کے لیے گھائے کا سودا نہیں ہوگا۔ اگر منظور ہو تو اپنے مینیجر کو قیمت بتا کر بھیجے گا۔“ میں بات ختم کر کے وہاں سے چل پڑا اور سیٹھ رحمان ہکا بکا سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ مزے وقت میں نے لیتی کی آنکھوں کی نمی، اپنی؟ آنکھوں میں آنرتی محسوس کی تھی اور پھر ساری رات اس نمی نے میری پلکیں بھگوئے رکھیں۔ بظاہر باہر سے اجلی اور؟ آنکھوں کو بخیرہ کر دینے والی چمک لیے یہ دنیا اندر سے کبھی کبھی کتنی تاریک اور سیاہ نکلتی ہے۔

اگلے روز سیٹھ رحمان کا مینیجر اپنے وقت پر آن پہنچا۔ واقعی سیٹھ رحمان ایک کامیاب سوداگر تھا۔ مگر نہ جانے کیوں پھر بھی اس کی لگائی ہوئی قیمت مجھے بہت کم محسوس ہوئی۔ لوگ عموماً جسموں کے سودے کرتے وقت ان کے اندر بسی روح کی قیمت لگانا بھول جاتے ہیں۔ کمائی پچھلے دو چار دن سے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس روز سیٹھ رحمان کے مینیجر کے جانے کے بعد اپنی چپ پر قابو نہیں رکھ پایا ”اگر آپ بُرا نہ مانیں سُر! تو میں ایک بات کہنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں، عہدے اور رتبے میں؟ پ مجھ سے بہت بلند ہیں، مگر عمر میں، میں آپ سے بڑا ہوں۔ لہذا مجھے میرے تجربے کی رعایت دیتے ہوئے کچھ عرض کرنے دیں۔“ میں نے اطمینان سے اس کی یہ لمبی تمہید سنی۔ ”جتنی دیر میں تم نے یہ تمہید باندھی ہے، تم اپنی بات ختم بھی کر سکتے تھے۔“ کمائی میری بات سن کر سٹ پٹا سا گیا۔ ”جی سُر... میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے سیٹھ رحمان کی بہت زیادہ قیمت لگا دی۔ میں جانتا ہوں، یہ آپ کا ذاتی پیسا ہے، اور اُسے خرچ کرنے کا حق بھی صرف؟ پ ہی کو ہے، مگر آپ کو ابھی سودے بازی نہیں؟“ تھی۔ میں جب آپ کو یوں بے دریغ دوسروں پر پیسا لٹاتے دیکھتا ہوں، تو نہ جانے کیوں بہت دکھ ہوتا ہے۔ عمریں لگ جاتی ہیں، یہ پیسا کمانے میں۔ اس طرح تو آپ خود کو بہت جلد برباد کر دیں گے۔ اگر جذبات میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے، تو میں معافی چاہتا ہوں، مگر میں نے آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھا۔“ کمائی بات ختم کر کے چپ ہو گیا۔ ”تم نے ٹھیک کہا کمائی! مجھے سودے بازی نہیں آتی، اچھا سودا گر نہیں ہوں میں۔ انسانوں کی قیمت لگانا نہیں جانتا، کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ قیمت صرف چیزوں

کی لگائی جاتی ہے، انسان اور رشتوں کی نہیں۔ اچھا میرے ایک سوال کا جواب دو، عام طور پر انسان، پیسا کس لیے کماتا ہے؟“ کمالی نے بلا تامل جواب دیا ”اپنے خواب پورے کرنے کے لیے سر! اپنے لیے آسائشیں اور آسانیاں پیدا کرنے کے لیے، اور اپنے لیے خوشیاں خریدنے کے لیے، عزت اور رتبے کے لیے۔“ ٹھیک کہا تم نے، مگر جب کسی کا کوئی خواب ہی باقی نہ بچا ہو، اسے آسائشیں اسے بوجھ لگتی ہوں اور اس کی خوشی کسی ایک لمحے میں جامد ہو کر رہ گئی ہو، تب وہ شخص کیا کرے؟“ کمالی کچھ دیر خاموش رہا۔ ”پھر شاید وہ شخص اس دنیا کا ہی نہ ہو سر! کیوں کہ آسائشیں، رتبے اور خوشی سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔“ میں مسکرایا۔ ”ہاں! کوئی دیوانہ ہی ہوگا، جسے ان چیزوں سے انکار ہو، مگر ابھی کچھ باقی ہیں دنیا میں۔ مجھے سوداگر بننے میں ابھی کچھ وقت لگے کمالی۔ خیر چھوڑو، تم نہیں سمجھو گے، اور کمالی، تم نے بھی تو سیٹھ رحمان کے ساتھ ایک سودا کیا تھا۔ تمہارا سودا کیسا رہا...؟“ کمالی نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں، کیسا سودا...؟“ ”ہاں، وہی سودا، جو کنٹریکٹ سیٹھ رحمان کو دلوانے کو صورت میں تمہیں پانچ لاکھ روپے منافع ملنے کے بدلے ملے ہوا تھا۔“ کمالی کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ ”وہ سر... وہ... میرا مطلب ہے...“ میں نے غور سے کمالی کی طرف دیکھا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کمالی! میں نے ویسے بھی وہ ٹھیک سیٹھ رحمان ہی کو دینا تھا۔ بس میری اتنی بات یاد رکھنا، پیسا کبھی عزت نفس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ وقت ملے تو میری بات پر غور کرنا۔ اب تم جا سکتے ہو۔“ کمالی سر جھکائے میرے کمرے سے نکل گیا۔

اگلے دو ہفتے بہت مصروف گزرے، اس دوران میں اپنے بھائیوں کے نئے گھر بھی ہو آیا، بہنوں کی طرف بھی چکر لگایا، خوب آؤ بھگت ہوئی میری، مگر ان میں سے کوئی بھی، یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ میں یوں تنہا اتنے بڑے گھر میں پوری زندگی گزار دوں۔ سبھی کو میرا گھر بسانے کی جلدی تھی، مگر ان میں سے شاید یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ جب دل ہی جل جائیں، تو گھر نہیں بسا کرتے۔ میرا دل بھی جل کر رکھ ہو چکا تھا۔ اب کوئی اُمید، کوئی آس باقی نہیں رہ گئی تھی کہ کبھی کوئی نظر میری طرف بھی اٹھے گی۔ بظاہر میرے ارد گرد ایسی بہت سی نازنینا کُن تھیں، جن میں سے میں، کسی ایک کی جانب بھی اشارہ کر دیتا، تو اس کے گھر والے بہ صد خوشی اسے میرے ساتھ رخصت کر دیتے، مگر یہ میرا نہیں، میری ظاہری شان و شوکت اور اس دولت کا کمال ہوتا، جسے ابھی تک خود میرے گھر والے بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے اور چہ گویاں ہوتی رہتی تھیں کہ آخر دس سال کے اندر اندر میرے ہاتھ الہ دین کا ایسا کون سا چراغ لگا ہوگا کہ جس نے میری کایا ہی پلٹ دی، ہمارا معاشرہ بھی کتنا دوغلا ہے۔ جس شخص کی غیر موجودگی میں اس کے رتبے اور دولت پر ناجائز ہونے کے شک میں ہزار باتیں بناتا ہے۔ اسی شخص کے آنے پر اس کو پوری تعظیم کے ساتھ کھڑے ہو کر ملتا ہے۔ اُس سے ہزار سفارشیں کرواتا ہے اور ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بہروز کریم ٹھیک ہی کہتا تھا، دولت ہزار عیبوں کا ایک پردہ ہے۔

کچھ روز بعد احمد صاحب چند طلبہ کے ساتھ میرے دفتر آئے اور بہت دیر بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ساتھ اس سال کا یونیورسٹی کا سالانہ رسالہ بھی لائے تھے، جس میں میری تین پُرانی نظمیں چھپی تھیں۔ میں نے ان کے لاکھ انکار کے باوجود یونیورسٹی کی بزمِ ادب کے لیے سال بھر کا چندہ ان کے حوالے کر دیا۔ ویسے بھی میری کمپنی سے شہر کی تقریباً ہر بڑی ادبی تحریک اور تنظیم کو عطیات جاتے رہتے تھے۔ شہر میں، میں کافی ادب دوست مشہور ہو چکا تھا، مگر میں خود ان ادبی پروگرامز میں جانے سے گریز کرتا تھا، کیوں کہ اب میں شاید، اپنے لفظوں اور شخصیت کے اس واضح تضاد سے اکتا چکا تھا۔ یا پھر اچھے لفظ اور اچھے خیالات صرف اچھی شخصیت کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ مجھ جیسا کوئی کتنے ہی اونچے خیالات کو لفظوں کی خوب صورت مالا میں پرو کر پیش کر دے، حرف بے وقعت ہی رہتے ہیں۔ میں خود کو مزید کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اگلے دن بڑے بھیا کسی کی سفارش کے لیے دفتر آئے، تو میں ان سے اپنے پرانے رجسٹر اور مسودوں کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی وہیں پرانے گھر کی دو جھتی والے ٹرک ہی میں پڑے ہوں شاید، کیوں کہ بہت سا سامان نئے مکان میں منتقل ہونا باقی تھا۔ پُرانے گھر کا سودا ہو چکا تھا اور کچھ دن میں وہاں سے سارا سامان بھی اٹھوانا تھا۔ جانے میرے دل میں اچانک ہی میرے پرانے گھر اور محلے کے لیے ایک دم ہی ہنوک سی کیوں اٹھی۔ میں نے کاغذات تلاش کرنے کے بہانے بھیا کے ساتھ ڈرائیو کو بھیج کر پُرانے گھر کی چابی منگوائی اور اسی شام عصر کے وقت میری گاڑی میرے پرانے محلے کے سال خوردہ لکڑی والے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں نے گاڑی محلے کے بڑے میدان سے پُرے ہی رکوالی۔ سامنے کچھ بچے کچے کھیل رہے تھے۔ میں بہت دیر وہیں کھڑا، انہیں یہ کھیل کھیلے دیکھتا رہا۔ غریب محلے کے بچوں کے کھیل بھی سدا غریبانہ ہی رہتے ہیں۔ کبھی میں بھی اپنی گلیوں اور اسی میدان میں باقی بچوں کے ساتھ سارا دن کچے اور گلی ڈنڈے کا کھیل کھیلا کرتا تھا اور شام کو منجھن منجھپائی، مگر زندگی میرے ساتھ ابھی تک منجھن منجھپائی ہی کا کھیل کھیلتی آرہی تھی۔ محلے کے پرانے کینوں میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ زیادہ تر نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ غربت البتہ وہی پُرانی تھی۔ میں نے کبیر خان کو اپنے گھر کا دروازہ کھولنے کو کہا اور پھر اسے گاڑی کی جانب واپس بھیج دیا، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں اترتی نمی دیکھ سکے۔ ہمارے کچھ جذبات اور احساسات بہت ذاتی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتے۔ میں بہت دیر تک اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں کھڑا ان بیٹے دنوں کو یاد کرتا رہا، جب میں دنیا کے ہر غم سے آزاد، اپنے چھوٹے قدموں سے اس صحن میں دوڑتا پھرتا تھا، باورچی خانے سے

اماں کی باجیوں کو ڈانٹنے اور گھڑاپے کے گر سکھانے کی آوازیں آتی رہتیں۔ ابا صحن میں اپنا حقہ سنبھالے کھانستے اور اخبار پڑھتے رہتے۔ میں مٹی کے صحن میں اپنی پرانی ٹین کی بنی کھلونا موٹر کار کے لیے راستے بناتا رہتا اور دن میں سو سو مرتبہ اس زنگ لگی کار کو اماں کے دوپٹے سے چکاتا رہتا، ایک لمحے ہی میں میرے آس پاس یہ سب کچھ اس شدت سے میری یاد کے جھروکوں سے باہر چھلکا کہ وہ سب لمحے پھر سے زندہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ میں اس وقت ابا کے حقے کا کڑوا دھواں اور باورچی خانے سے آتی گرم مٹھلکوں کی مہک بھی محسوس کر سکتا تھا۔ کاش میں ساری زندگی وہی پانچ چھ سالہ پُری زادی ہی رہتا، کبھی بڑا نہ ہوتا۔ جانے ہم اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟ ہر بچہ اپنی ماں کے لیے پُری زادی تو ہوتا ہے، تو اگر میری بھولی بھالی ماں نے مجھ جیسے کا نام بھی پُری زادر کھ دیا، تو ایسا کیا گناہ کیا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اچانک مجھے اپنے کانوں میں ابا کی آواز بھی گونجتی محسوس ہوئی۔ ”پُری زاد... بیٹا... تم پُری زادی ہونا“ میں ایک جھٹکے سے اپنے خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ کوئی مجھے واقعی پکار رہا تھا۔ جسے میں ابا کی آواز سمجھا تھا، وہ ہمارے محلے کے ایک بزرگ بشیر چچا کی آواز تھی، میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ کر پلٹ کر دیکھا۔ گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر گلی سے گزرتے کچھ پرانے محلے دار گلی میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے، جن کے ہاتھوں میں میرا بچپن کھیلا تھا۔ سبھی گھل مل گئے اور پُرانی یادوں کے سب در پیچے وا ہو گئے۔ وہ سب ابا کے دوست اور ساتھی تھے اور پُرانی باتیں یاد کر کے سب بیک وقت خوش اور غم گین سے ہو گئے تھے۔ گویا یاد ماضی صرف میرے لیے ہی عذاب نہیں تھی، اور ابھی بہت تھی، جو اس عذاب سے دوچار تھے۔ وہ سب میری ترقی دیکھ کر حیران اور دل سے خوش نظر آ رہے تھے۔ یہ پرانے محلے دار بھی

بڑے دل چسپ رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ جب تک ساتھ رہتے ہیں، زیادہ تر ایک دوسرے سے خفا اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، مگر انہی میں سے جب کوئی ایک چھڑ کر کہیں اور چلا جاتا ہے اور عرصے بعد ملتا ہے، تو یہ سارے خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر اُسے یاد کرتے ہوئے یوں استقبال کرتے ہیں، جیسے وہ ہم سارے نہیں، کوئی ماں جایا ہو۔ یہ انسانی رشتے ہمیشہ دور جا کر ہی خوب صورت کیوں بن جاتے ہیں؟ فاصلے ہمارے رویوں میں اتنی بڑی تبدیلیاں کیسے لے آتے ہیں۔ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ ٹکڑ والے منظور پچا کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔ ”ارے ہاں پڑی زاد بیٹا! وہ مرزا صاحب کا پوچھنے ضرور جانا۔ بہت بیمار رہتے ہیں آج کل، ضعیف بھی بہت ہو گئے ہیں۔ مرزا صاحب کا نام سنتے ہی میرا گال اچانک جلنے لگا۔ ان کا لگایا ہوا طمانچا آج تک میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں گونج رہا تھا اور تب ہی اچانک ہی وہ!؟ فٹ جاں، ناہید یاد آ گئی۔ اس کا تو ماجد سے رشتہ ہو گیا تھا۔ جانے اب وہ کیسی ہوگی؟

محلے کے بچے میری گاڑی کے گرد جمع تھے اور ڈرائیور انہیں بھگانے کے لیے مختلف طریقے آزما رہا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ مرزا صاحب کے دروازے کے سامنے رُک گیا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی حالت پر ہنسی آ گئی۔ اب تو وہ کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور میں ہوں کہ آج بھی اس کے گھر کے سامنے کھڑا اپنے بے چین دل کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوں۔ سب اس دشمن دل کے تماشے ہیں۔ میری دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی کے قدموں کی!؟ ہٹ بلند ہوئی۔ میں ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والی نے دروازہ کھولا، تو اس کی نظر مجھ سے پہلے ڈور کھڑی میری کار پر پڑی، اور پھر میری نظر، اس کی نظر سے ملی تو جیسے سانس رکنے لگی۔ وہ ناہید ہی تھی۔ ناہید بھی گڑبڑ اسی گئی۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

”آپ...! آپ پڑی زاد ہیں ناں۔ مجھے ہم سانیوں نے بتایا تھا کہ آپ محلے میں آئے ہوئے ہیں، مگر میں بالکل بھی یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ آپ ہمارے گھر بھی آئیں گے۔“ ناہید کے بال الجھے، کپڑے مسلے ہوئے اور پیروں میں پڑانی چہل تھی۔ اس کا جسم پہلے سے کافی فریب لگ رہا تھا اور وہ طرح دار، شوخ، نازک اور نٹ کھٹ سی لڑکی، مجھے اس سامنے کھڑی عورت میں بہ مشکل ڈھونڈنے سے حصے بخروں میں کئی نظر آ رہی تھی۔ ناہید نے سٹ پنا کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ ”آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آ جائیں۔ ابا گھر پر ہی ہیں۔“ میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ یہ وہی صحن تھا، جہاں میں کبھی شام کو گھنٹہ بھر کے لیے ناہید کو ٹیوشن پڑھانے انگور کی بتل کے سائے میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا اور دن کے باقی تیس گھنٹے، اُسی ایک گھنٹے کی یاد میں گزار دیتا تھا۔ صحن میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے بچے شور اور اودھم مچا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے گھرے پر رکھا پیتل کا گلاس زور سے پکے فرش پر گرا دیا، تو شور مچ گیا۔ ناہید نے غصے میں اس بچے کو دو حتر مارے اور شرمندگی سے چلائی۔ ”چپ کر جاؤ کم بختو! دیکھ نہیں رہے، گھر میں مہمان آئے ہیں۔ چلو، نکلو یہاں سے۔ باہر جا کر کھیلو۔“ بچے منہ بسورتے صحن سے نکل گئے۔ اندر سے مرزا صاحب کھانستے ہوئے باہر صحن میں نکل آئے۔ ”کون آیا ہے، ناہید بیٹا...“ ناہید نے جلدی سے صحن میں

پڑی پڑانی کرسی میرے لیے سیدھی کی ”پڑی زاد!؟“ بے ہیں اباجی، ہمارے پرانے ہم سائے۔“ مرزا صاحب نے چونک کر اپنا چشمہ درست کیا اور مجھے غور سے دیکھا۔ ”ارے پڑی زاد بیٹا! کیسے ہو تم، تمہارے بھائیوں سے پتا چلا تھا کہ تم پاکستان آ چکے ہو۔ اچھا کیا آ گئے، تمہیں دیکھے بہت عرصہ ہو گیا۔“ مرزا صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ناہید میری موجودگی کی وجہ سے بہت الجھی ہوئی اور بے آرام سی دکھائی رہی تھی۔ پھر اچانک مرزا صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ ”ارے ہاں، یاد آیا۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کر دی تھی میاں۔ بعد میں حقیقت کھلی تو تم یہاں سے جا چکے تھے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“ میں نے جلدی سے کہا ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بزرگوں کا حق ہوتا ہے۔ مگر یہ ماجد کہاں ہے، دکھائی نہیں دے رہا۔“ مرزا صاحب نے بُرا سا منہ بنایا ”ارے ہوگا کہاں... کہیں نوکری کی تلاش میں در بدر بھٹک رہا ہوگا۔ ناہید کی ماں کے انتقال کے بعد اسے تو موقع ہی مل گیا۔ مہینوں اپنے بیوی بچوں کو یہاں میکے میں میری خدمت کے بہانے چھوڑ کر جانے کہاں غائب رہتا ہے۔ بہت سے کاروبار آزمائے اس نے، مگر کچھ نہ تھا نہیں۔!؟ آج کل نوکری کے لیے دھکے کھاتا رہتا ہے۔“ ناہید چائے کا کپ لیے نمودار ہوئی اور اس نے باپ کو گھور کر دیکھا۔ ”بس کریں اباجی، یہ وقت بھلا ان باتوں کا ہے؟“ ”میں کن اکھیوں سے ناہید کو دیکھتا رہا۔ یہ نازک شاخ گل جیسی لڑکیاں شادی کے بعد اتنی جلدی اپنا زوپ کیوں بدل لیتی ہیں، یا پھر شاید، ماجد جو اس کا محبوب تھا اور بطور شوہر اس کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، اس کے لیے ناہید اب بھی اتنی ہی دل کش اور خوب صورت ہو۔ کہتے ہیں خُسن جب ہمارے روزمرہ کے معمول میں شامل ہو جائے، تو عموماً اپنا اثر کھودیتا ہے، یا پھر سدا کے لیے اپنے پہلے تاثر کے ساتھ ہماری یادداشت میں جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں نے پورے دس سال کے بعد ناہید کو دیکھا تھا، اس لیے شاید میں اس کے بڑھتے ہوئے وزن سے کچھ الجھن محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا محبوب کے روپ بدل لینے سے ہماری محبت کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے؟ یا پھر حسن پرستوں کا شیوہ ہی میری غزل اور خیام کی رباعی کو کسی سراپے میں ڈھلتے ہوئے دیکھنا ہوتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں مگن چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا۔ ناہید سر جھکائے میرے قریب ہی کھڑی تھی، اتنے میں اچانک صحن کا دروازہ کھلا اور گرد اور دھول میں انا ایک تھکا ہارا سا شخص اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں کی نظر ملی۔ ناہید کو میرے قریب کھڑے دیکھ کر اس شخص کے ماتھے پر تیوریاں سی پڑ گئیں۔ ناہید بھی کچھ گھبرا سی گئی اور جلدی سے اس کی جانب بڑھی ”ارے ماجد... تم آئے... دیکھو، پڑی زاد صاحب ہمارے گھر آئے ہیں۔ پچھانا نہیں تم نے انہیں۔“ ماجد نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)



ہاشم ندیم نو جوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاؤ“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زبردست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماجد شدید غصے کے عالم میں ناہید کو گھور رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے اسے سرگوشی میں کچھ کہا، تو اس بار ماجد میری طرف متوجہ ہوا اور پھر اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ارے پُری زاد تم..... میرا مطلب ہے آپ پُری زاد ہی ہونا..... معاف کرنا، میں تمھیں کی وجہ سے پہچان نہیں سکا۔“ شاید ماجد بھی میرے قیمتی اعلیٰ لباس اور باہر کھڑی نئی گاڑی سے مرعوب ہو کر فوراً تم سے آپ پر آگیا تھا۔ انسان نے مرعوبیت کے لیے کتنی ناپائیدار اشیاء کو پیانا نہ بنا رکھا ہے۔ میں نے گہری نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وقت کی دھول شاید کچھ زیادہ ہی تیزی سے تہ جمار ہی تھی۔ بہت تھکا ماندہ سا نظر آ رہا تھا۔ کبھی یہی ماجد ہم سب محلے کے لڑکوں کے لیے رشک کا باعث ہوا کرتا تھا اور میں تو خود کو اس پر رشک کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس ہستی کا محبوب تھا، جس کی پلک کا ایک اشارہ مجھے عُمر بھر کے لیے خاستر کر گیا..... اور آج اتنے برسوں بعد وہ شعلہ جوالہ، میرے سامنے راکھ بنی کھڑی تھی اور اس کا وہ گل فام، غم دوراں کے پھیرے میں سب کچھ بھولا دکھائی دیتا تھا۔ کون خوش ہے بھلا اس ناشناس زمانے میں؟ جنہوں نے پایا، انہوں نے پا کر مٹی کر دیا اور چوپا نہیں سکے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے خاک ہوئے، مجھ سے زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ میں نے آتے وقت اپنا کارڈ ماجد کو دے دیا کہ وہ اگلے روز میرے ایک فیکٹری منیجر سے مل لے۔ میں اپنی گاڑی میں جب گلی سے باہر نکل رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر میں ناہید کو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے جاتے وقت کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر، میں کیا بات کرتا اس سے؟ وہی معذرتیں، وہی ”میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا“، ”میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی“ ”آپ دل کے بہت اچھے ہیں.....“ وغیرہ وغیرہ، کتنا مصنوعی لگتا ہے یہ سب کچھ۔ کچھ معذرتیں اور وضاحتیں تو پُہانے گھاؤ مند مل کرنے کے بجائے زخموں کا سینہ مزید کھول دیتی ہیں۔ میں بھی اپنے یہ کھلے زخم لیے گھرواپس پہنچا، تو رات ڈھل رہی تھی۔ کمالی نہ جانے کب سے سوئمنگ پُل کے پاس کچھ فائزر گود میں لیے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ضروری کاغذات پر دستخط کر کے فائزر اُسے واپس کیے ”صبح لے آتے کمالی، زندگی کو اتنا بوجھل کیوں کر رکھا ہے تم نے، جب تک میرے ساتھ کام کر رہے ہو، نفع نقصان ذہن سے نکال کر کام کیا کرو۔ میں نے تمہیں اُس دن بھی بتایا تھا کہ میرے نقصانات اور فوائد کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ میں زندگی میں اتنی بار ہار چکا ہوں کہ اب جیت مجھے کسی بھی ہار سے کہیں زیادہ اُداس اور پریشان کر دیتی ہے، کل ٹینڈر رُکھ دینا باقی اللہ مالک ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو۔“ کمالی سُر ٹھکائے کھڑا رہا۔ ”مجھے آپ کو، کچھ اور بھی بتانا تھا سُر..... آج صبح میں نے سیٹھ رحمان کا دیا ہوا چیک واپس کر دیا ہے۔ آپ کے ایک جیلے نے مجھے عزت نفس کا وہ سبق سکھایا ہے کہ اب کبھی میرے قدم نہیں ڈمگائیں گے۔ آپ بھی میری اس خطا کو آخری سمجھ کر معاف کر دیں۔“ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ”بھول جاؤ کمالی، زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہوند ہو، یہ بھول جانے کی نعمت ہونا بہت ضروری ہے۔“ کمالی پلٹ کر جانے لگا، تو میں اچانک اس سے پوچھ بیٹھا۔ ”کمالی! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟“ کمالی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”ہاں سُر! بڑا زوردار عشق چلا تھا نو جوانی میں اپنا، مگر انجام بہت بُرا ہوا آخر کار۔“ میں نے گھبرا کے پوچھا ”کیوں..... کیا ہوا تھا؟“ کمالی نے لمبی سی سانس بھری۔ ”ہونا کیا تھا سُر جی، شادی ہو گئی میری اُس کے ساتھ، آج وہ میرے چار بچوں کی ماں ہے۔ سارا عشق بھاپ بن کے اُڑ گیا، گھر بیوروں سے خرچوں، بچوں کی فرمائشوں اور فیسوں نے کمر توڑ کے رکھ دی۔ ساری محبت ہوا ہو گئی۔“ کمالی اپنے دکھڑے سنا کر چلا گیا اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نادان انسان ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ محبت کو پالینا بڑا حادثہ ہے یا اس کا کھوجانا بڑا سانحہ؟ کیا شے ہے یہ محبت، ہم جلتا ہوں یا غیر جلتا، یہ محبت ہر پل ہمارے آس پاس کن سونیاں لیتی، ہماری سرگوشیاں سُنتی رہتی ہے تاکہ ہمارے خلاف پھر کوئی بھرپور سازش رچا سکے۔ میری یہ خُسن پرستی بھی تو اُسی ستم گر کی ایک سازش تھی۔ لوگ باتیں بنانے لگے تھے کہ میرے آس پاس خوب صورت چہروں کا مجمع اکٹھا رہتا ہے۔ دفتر میں، باہر فیلڈ کے عملے میں، دہلی کے دفاتر اور کمپنیوں میں، ہر جگہ انتخاب اگر میرے فیصلے سے ہوتا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی حسین چہرہ ہی نکلتا، چاہے پھر میرا زندگی بھر اس چہرے سے کبھی آمنا سامنا ہی نہ ہو، مگر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ جس طرح ہم میں سے کچھ صفائی پسند ہوتے ہیں، کچھ نفاست پسند، کچھ کونا زک اشیاء پسند آتی ہیں اور کچھ خوشبوؤں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں خُسن پسند تھا اور بس.....

اگلے روز مجھے سائٹ ایریا والی فیکٹری کے منیجر نے بتایا کہ ماجد کو اس کی قابلیت کے اعتبار سے کسی دفتر میں کام پر لگادیا گیا ہے اور تن خواہ بھی معقول طے ہو گئی ہے۔ رات ایک میٹنگ سے گھر آتے آتے بہت دیر ہو گئی۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ رات کو جانے پہچانے رستے بھی کسی اجنبی کی طرح ہمارا استقبال کرتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں، دن پوشیدہ گوشوں کو اپنی روشنی سے اُجال کر اُن کی شناخت ظاہر کرتا ہے، مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے لوگوں، جگہوں، چیزوں اور چہروں کی اصل پہچان رات کے اندھیرے ہی میں ہوتی ہے۔ ڈرائیور نے میری بوریت کے خیال سے گاڑی کا ایف ایم ریڈیو چلا دیا۔ یہ ایف ایم ریڈیو بھی ایک اچھا فرار ہے، لمبے راستوں کو مختصر کرنے کا۔ ایف ایم کا ڈی جے یا کمپیئر اگر پڑھا لکھا اور زندگی سے شناسا ہو تو ہماری تنہائی بانٹ لیتا ہے، اُس روز بھی وہ میزبان میری تنہائی بانٹنے کے لیے شعر و ادب کی باتیں کر رہی تھی۔ میں بے دھیانی میں بیٹھا اس کی میٹھی باتیں سُن رہا تھا کہ اچانک اپنی نظم کے دو بول سُن کر زور سے چونک اٹھا، میزبان کی آواز سُننے میں گونج رہی تھی۔ ”جی ہاں، یہی ہے میری پسندیدہ نظم کا عنوان“ ”مگر کبھی تم کو مجھ سے نفرت ہو جائے..... تو ان راستوں سے نفرت مت کرنا..... جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے.....“ اُس رات کے اندھیرے میں، خود اپنی نظم اس ایف ایم کی میزبان کی زبانی سُن کر جانے کیوں میری پلکیں نم ہونے لگیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔ ”جی سامعین! یہ تھی میرے پسندیدہ شاعر، پُری زاد کی وہ نظم، جو میں اکثر گنتا رہی ہوں، مگر مجھے اُن سے ایک لگہ بھی ہے۔ میں اُسی یونیورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ ہوں، جہاں پُری زاد نے دورانِ تعلیم کچھ نظمیں، غزلیں کہیں، مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اگر خوش قسمتی سے وہ یا ان کا کوئی جاننے والا اس وقت میرا پروگرام سُن رہے ہوں، تو ان سے میری اور اس پروگرام کے ہزاروں سامعین کی بس یہی ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ وہ لفظوں سے اپنا نانا تانہ توڑیں۔ اب آپ سے آپ کی میزبان

قراۃ العین بخاری اجازت چاہتی ہے۔ کل پھر رات گیارہ بجے آپ کے پسندیدہ پروگرام ”بزمِ ادب“ کے ساتھ حاضر ہوں گے، تب تک کے لیے اپنا بہت سا خیال رکھیے، شب بخیر۔“ میں پروگرام سننے میں اس قدر مگن تھا کہ پتائی نہیں چلا کہ ہم کب گھر پہنچ گئے۔ رات بھی بستر پر کروٹیں بدلتے، اُن گنت سوچوں میں گزری۔ مجھے اپنے ایک اردو کے استاد کی بات ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ لفظ اپنے خالق کا ہمیشہ پیچھا کرتے ہیں۔ اُس کی پہچان بن کر ہمیشہ کے لیے وقت کی کسی لہر میں امر ہو جاتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میری ٹوٹی پھوٹی شاعری اور بے بسی کے عالم میں لکھی چند نظمیں میری یونیورسٹی کے سالانہ رسالے میں بچھپ کر یوں امر ہو جائیں گی کہ اتنے برسوں بعد بھی میری شناخت بنی رہیں گی۔

اگلے روز دفتر پہنچا تو یونیورسٹی سے احمد صاحب پہلے ہی آئے بیٹھے تھے اور کافی خفا بھی تھے، کیوں کہ میں کسی نہ کسی بہانے ان کی تمام تقریبات کے دعوت نامے ٹالتا آیا تھا۔ مگر اس روز ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی وعدہ لے کر ہی انھیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلی شام یونیورسٹی کی بزمِ ادب کی سالانہ انعامات کی تقریب تھی اور وہ پہلے ہی زبردستی کارڈ پر میرا نام بھی مہمان خصوصی کے طور پر درج کروا کے آئے تھے۔ میں نہ نہی کرتا رہ گیا، لیکن وہ دھمکی دے گئے کہ اگر اس بار بھی میں نے تقریب میں شرکت نہ کی، تو وہ آئندہ کبھی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر بیٹھنے اور ان کے سامنے کچھ بولنے کے خیال ہی سے میرے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ وہی چبھتی نظریں، جو مجھے اپنے آ رہے ہوئے محسوس ہوتی ہیں، وہی دبی دبی سرگوشیاں، طنزیہ مسکراہٹیں، کاش احمد صاحب میرے اس دلِ ناکارہ کی حالت سمجھ سکتے، مگر یہ ہونہ سکا اور اگلے روز ٹھیک شام 5 بجے اسٹیج کے ڈائس پر میرا نام پکارا گیا، تو میں نظریں اٹھا کر دیکھا کہ مائیک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہال میں تماشاخیوں کی جانب روشنی لگائی تھی، اسی لیے مجھے طلبہ کے چہرے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے اور ویسے بھی اسٹیج کا فاصلہ پہلی روکی کرسیوں سے کافی زیادہ تھا، اپنی سانس درست کرنے میں مجھے چند لمحوں مزید لگ گئے۔ میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگی۔ طلبہ اور دیگر عملہ انہماک سے میری بات سُن رہا تھا۔ ”میں کوئی شاعر، مقرر یا لیڈر نہیں ہوں..... بس، کچھ مہربانوں کی محبت مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے اور میری اس درس گاہ کا مجھ پر جوتی ہے، وہ مجھے ہمیشہ اس چار دیواری سے جوڑے رکھتا ہے۔ میں احمد صاحب اور ان تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے سالانہ شمارے میں میرا تعارف اور چند پُرانی نظمیں شامل کر کے، میرے کچھ بوسیدہ اشعار کو زندہ رکھا۔ یہ اشعار دراصل اشعار نہیں، میرے دل کی نثر ہیں۔ میری اپنے آپ سے کی گئی کچھ باتیں ہیں، جو کبھی صفحات پر آگئیں تو آپ لوگوں سے بانٹ لیں۔ آپ لوگ اسے شاعری سمجھتے ہیں تو یہ آپ کا حسنِ ظن اور ظرف ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔“ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹنے لگا تو دراک قطار میں بیٹھی، سیاہ چشمہ لگائے ایک قلعی سی لڑکی کھڑی ہو گئی اور ناظرین کے لیے رکھا ہوا مائیک ہاتھ میں لے کر بولی۔

”سر! میرا نام قراۃ العین ہے۔ میں اسی یونیورسٹی میں فائنل ایئر کی طالبہ ہوں اور رات گئے ایف ایم ریڈیو پر ”بزمِ ادب“ کے نام سے ایک پروگرام بھی کرتی ہوں۔ میرے سننے والوں کی ایک بڑی تعداد تک آپ کی شاعری میرے پروگرام کے توسط سے پہنچی ہے اور وہ سب آپ سے مزید کچھ نیا سننے کی خواہش رکھتے ہیں، مگر آپ نے یونیورسٹی کے بعد تازہ کچھ کہا ہی نہیں۔ کیا ہم امید رکھیں کہ آپ پھر سے اپنا نانا حروف سے جوڑنے کی کوشش کریں گے؟“ میں نے مختصر جواب دیا۔ ”جی ضرور..... اگر غمِ دوراں نے کچھ مہلت دی تو.....“

ابھی اک رات قبل ہی میں نے اس لڑکی کا پروگرام سُنا تھا اور آج اس سے ملاقات بھی ہو گئی، کبھی کبھی وقت کی چالیں بھی کتنی ہی تلی ہوتی ہیں۔ تقدیر اپنا اسکرپٹ کیسے دھیمے انداز میں لکھنا شروع کرتی ہے، ہم معصوم انسانوں کو قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ مقدر کا یہ مسودہ آگے چل کر ہم پر کیسی قیامتیں ڈھانے والا ہے۔ میں بھی آنے والے محشر سے بے خبر تقریب کے خاتمے کے بعد گھر روانہ ہوا تو کمالی سے رہا نہیں گیا۔ ”سر! آپ نے کبھی بتایا نہیں، آپ تو بہت مشہور شاعر ہیں۔ ساری یونیورسٹی آپ کے لیے ہال میں جمع تھی۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”یہ خود میرے لیے بھی ایک خبر ہے، اتنے برسوں بعد بھی میرے حرف میری شناخت ہیں۔ مجھے خود بھی حیرت ہے۔“ ”اس میں حیرت کی کیا بات ہے سُر جی..... یہ آج کل کی نوجوان نسل ان چیزوں میں بڑی دل چسپی رکھتی ہے۔ ایف ایم، انٹرنیٹ اور حتیٰ کہ سیل فون پر بھی ہر دم ان چیزوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ میر، درد، غالب اور اقبال کو بھی ہم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں سُر۔ بظاہر بڑی لاابالی ہے یہ نئی نسل، مگر اپنے مطلب کی چیز پڑھتی اور سُنتی ہے۔ چاہے کتاب کے ذریعے یا کسی اور طرح.....“ میں چُپ رہا۔ ”ارے ہاں یاد آیا، وہ ایف ایم کی ڈی جے لڑکی نے آپ کا سیل نمبر مانگا تھا، رات کو اپنے پروگرام میں آپ کو براہِ راست شرکت کی دعوت دینا چاہتی تھی، میں نے آپ سے پوچھے بنا اسے نمبر تو دے دیا ہے، مگر خاص تاکید کی ہے کہ پہلے آپ سے خود بات کر کے اجازت طلب کر لے.....“ اور پھر رات گئے میرے موبائل فون پر ایک اجنبی نمبر جگمگانے لگا۔ تیسری کال پر مجبوراً مجھے فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف وہی تھی۔ ”معاف کیجیے گا سُر! شاید آپ کے مینیجر نے آپ کو میری درخواست نہیں پہنچائی۔ میں ڈی جے یعنی ہوں۔ میں اپنے پروگرام میں آپ کو لائیو کال پر مدعو کرنا چاہتی ہوں..... ہم آپ کے صرف دس منٹ لیں گے، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو.....؟“ میں نے کچھ لمحوں توقف کیا۔ ”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ.....؟“ وہ مومنیت سے بولی۔ ”کچھ عام سے سوال، آپ کی زندگی کے بارے میں، آپ کی کامیابیوں کے بارے میں، آپ کی ادب دوستی کے بارے میں۔ سُنا ہے، شہر کی سبھی بڑی ادبی تقریبات اور مستقبل کے منصوبوں میں آپ کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے سامعین تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ آپ کی ترقی کا راز جاننا چاہتی ہوں، عام طور پر ادب سے بچے لوگوں کو یہ معاشرہ مادی ترقی سے بہت دُور سمجھتا ہے۔ یہ ادیب، شاعر عموماً مفلوک الحال دکھائی دیتے ہیں، مگر آپ نے صرف خیالی نہیں، حقیقی دنیا کو بھی فتح کر دکھایا ہے۔ میں یہ سب باتیں جاننا چاہتی ہوں۔“ میں اس کی باتیں سُن کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ ”مگر آپ کو میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے پتا ہے؟“ وہ ہنس پڑی۔ جیسے بہت دُور کسی مندر میں ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بیچ اٹھی ہوں۔ ”احمد سُر نے بتایا، اور پھر میرے ریڈیو پروگرام کی وجہ سے شہر کی تقریباً سبھی بڑی ادبی

ہستیوں کے ساتھ ملاقات رہتی ہے میری۔ سبھی سے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سننے کو ملتا ہے۔ سچ کہوں تو لوگ بہت متحسّس رہتے ہیں آپ کے بارے میں.....“ وہ اپنی دھن کی پکلی لگتی تھی۔ میرے لاکھ ٹالنے کے باوجود، مجھ سے اپنے اگلے روز کے پروگرام کے لیے کچھ منٹ لینے میں کامیاب ہوئی گئی اور میں اگلے دن تمام وقت اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ رات، اس کے ساتھ کیا بات کروں گا؟ میں نے تو بہت زمانہ پہلے خود سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ شام تک یہ الجھن اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ میں نے اپنے پی اے کو یعنی کاوی فون نمبر ملانے کو کہا، جو گزشتہ رات میرے موبائل فون پر جگمگایا تھا۔ پی اے نے کال ملا کر میری طرف ٹرانسفر کی، تو دوسری جانب سے اس کی بے یقین اور کھلکھلاتی سی آواز سنائی دی۔ ”ارے سُر آپ.....؟ کتنا حسین اتفاق ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ نے خود مجھے کال کی ہے، میں ابھی رات کے پروگرام کی تیاری ہی کر رہی تھی۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”آپ سے ایک درخواست کرنی ہے، کیا ہم گزشتہ رات کیسے ہوئے معاہدے کو کچھ دن کے لیے آگے بڑھا سکتے ہیں، اگر ممکن ہو تو؟“ ”جی سُر، کیوں نہیں..... مگر کوئی خاص وجہ.....؟“ ”پتا نہیں، وجہ شاید خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ دراصل میں بہت الجھن ہی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا کبھی پسند نہیں رہا، آپ کچھ وقت دیں گی تو شاید میں خود کو تیار کر پاؤں، ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔“ دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ ”ٹھیک ہے

سُرا جیسے آپ کو مناسب لگے، مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ آپ نے پروگرام سے کافی دیر پہلے خود فون کر کے معذرت کر لی، ورنہ عام طور پر بڑے لوگ ہمیں اطلاع دینا بھی پسند نہیں کرتے، اپنی کسی غیر حاضری کی۔ مگر آپ کو یہ وعدہ تو بہر حال کرنا پڑے گا کہ آپ جب بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر پائے تو یہ معاہدہ پورا ضرور کریں گے۔“ میں ہنس پڑا۔ ”ہاں، چلیں وعدہ نبھانے کا ایک اور وعدہ سہی۔ میری مشکل سمجھنے کا شکریہ۔“ میں نے فون کاٹ دیا، مگر کہیں دُور کوئی دوسری لائن بُج رہی تھی۔ میرا نادان دل سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی، ہر نتیجے سے بے خبر پھر سے دھڑکنا چاہتا تھا اور میں بڑی سختی اور بے رحمی سے اسے صرف ایک ہی بات ساری رات سمجھا تا رہا کہ کچھ دلوں کا مقدر صرف بہتر کی گنتی پوری کرنا ہوتا ہے۔ وہ کچھ اور قلب ہوتے ہوں گے کہ جن کی تقدیر میں دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ بڑے نادان ہیں وہ لوگ، جو اپنے دل کے ایک فرض کو دھڑکنے سے تشبیہ دینے پھرتے ہیں۔ مگر یہ دل بھلا کب کسی کی سنتے ہیں۔ منہ زور، آزاد، وحشی اور جنگلی گھوڑے بھلا کس لگام کے قابو آتے ہیں۔ میرا دل بھی بے لگام ہونے کو آیا تھا۔

اگلے روز نہ چاہتے ہوئے بھی میں سارا دن اس کے فون کا انتظار کرتا رہا اور پھر شام ڈھلے، جب تھک ہار کر میرا بے چین مَن اپنی بے وقوفی پر مُسکرا کر کچھ آرام پانے کو تھا، تبھی اچانک اس کا فون آ گیا۔ قسمت کی آنکھ مچولی، وقت کا انتخاب خوب چُن کر کرتی ہے اور پھر ان ٹیلی فون کا لڑکا دورانیہ اور تعداد بڑھتی گئی۔ ہم بہت عام سی باتیں کرتے تھے۔ دن بھر کی مصروفیت کی، شام کی چائے کی، رات کی چہل قدمی کی، مگر یہ باتیں میرے لیے کتنی خاص تھیں، یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ اُس دن یونیورسٹی کی تقریب والی ملاقات کے بعد میری آج تک دوبارہ کبھی یعنی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، نہ ہی میں نے دوبارہ کبھی اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار ہی کیا تھا۔ یہ ٹیلی فون کی آدھی ملاقات میرے لیے کسی بھی بالمشافہ ملاقات سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں دوبارہ یعنی کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ہال میں مجھے کافی فاصلے سے اور مٹکے اندھیرے میں دیکھا، میں اپنے اور اس کے درمیان یہ اندھیرا ہمیشہ حائل رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دن اور روشنی میں اس سے ملنے کی جتنی ہی بھلا کب تھی۔ میرا بس چلنا تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے دن کے بارہ گھنٹوں کی روشنی بھی کشید کر لے، کیوں کہ مجھے اُجالے کبھی راس نہیں آتے تھے۔

اگلے روز میرے اسٹاف نے خوب صورت سجاوٹی کاغذ میں پیک شدہ ایک پارسل میری میز پر رکھ دیا۔ بیچنے والے پتے میں قرآن العین بخاری کا نام درج تھا۔ میں نے سب کے جانے کے بعد احتیاط سے کاغذ کی پرتیں کھولیں۔ اندر سے ایک خوب صورت سانما کُشی مجسمہ برآمد ہوا، جسے کمرے میں کہیں بھی شوپس کے طور پر رکھا جاسکتا تھا۔ میں نے جلدی سے یعنی کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے اس کی کھٹکتی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں جانتی تھی سر! آپ کا فون آتا ہی ہوگا۔ کہیے، کیسا لگا تھا؟“ ”بہت اچھا..... مگر موقع محل سمجھ نہیں سکا، میں اس تحفے کا۔ آپ نے تکلف کیا یعنی.....“ وہ ہنسی۔ ”ارے نہیں سر! بالکل بھی تکلف نہیں ہے۔ یہ میرا مشغلہ ہے۔ فارغ وقت میں، مَن مَنی اور پلاسٹر آف پیرس سے مجسمے بناتی ہوں۔ میری اپنی ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری ہے، میرے گھر کے اندر، بس وہیں یہ مشق جاری رہتی ہے۔ کبھی آپ بھی آئیے ناں وقت نکال کر، میں آپ کو اپنا کام دکھاؤں گی۔“ میں بولتے بولتے انک سا گیا۔ ”ہاں کیوں نہیں، مگر آپ اور کیا کچھ کرتی ہیں، ایک ہی بار اپنے سارے ہنر بتا دیں۔ کبھی کبھی حیرت در حیرت بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے دوستوں کے لیے.....“ میری بات سُن کر وہ شرما سی گئی۔ ”نہیں نہیں، مجھ میں بھلا کیا ہنر ہوگا۔ بس وقت کا نئے کے بہانے تلاشتی ہوں۔“ بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر میرا بھولا مَن اس لڑکی کے ہنر کا شکار ہوتا گیا۔ دل موہ لینا بھی تو ایک ہنر ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا ہنر۔ اور میں اس کی اس کاری گری سے خود کو بچا نہیں پارہا تھا۔ مگر پھر ایک دن ہمیشہ کی طرح بکتی، بگڑنے لگی۔ شام ہی سے میری طبیعت عجیب بے چین اور اُداس سی تھی، مجھے ایک بار پھر اپنے آس پاس سب کچھ بنا مقصد اور بے فائدہ دکھائی دے رہا تھا۔ دل کو چُپ سی لگی ہوئی تھی کہ اچانک یعنی کا فون آ گیا۔ ”کہاں غائب رہتے ہیں سر آپ، بہت دنوں سے آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں، مگر آپ کی مصروفیت کا خیال آڑے آ جاتا ہے۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”میری مصروفیت بس ایک فرار ہے، آپ کہیں، کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ وہ کچھ دیر چُپ رہی۔ ”در اصل میں آپ کا ایک مجسمہ بنانا چاہتی ہوں۔ پھر میں اُسے ساری دنیا کو دکھاؤں گی۔“ جانے کیوں پل بھر ہی میں، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ مجھے لگا کہ ساری دنیا کی طرح وہ لڑکی بھی آج میرا مذاق اڑانے کے موڈ میں ہے۔ اس نے مجھے دُور سے ہی سہی، مگر دیکھ تو رکھا تھا۔ ضرور اس نے در پردہ میرے چہرے کی تفحیک کا یہ طریقہ نکالا ہے۔ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔ ”مجسمے خوب صورت چہروں کے بنائے جاتے ہیں مس یعنی..... اور میں؟ بہر حال، مجھے آپ سے اس مذاق کی امید ہرگز نہیں تھی۔ آپ بھی دوسروں کی طرح ہی نکلیں۔“ میں نے فون پٹخ دیا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی، مگر میں نے اگلے پورے ہفتے اس سے بات نہیں کی۔ دفتر کے نمبر پر فون آیا بھی، تو اسٹاف سے کہہ دیا کہ مصروفیت کا بہانہ کر دے۔ اس نے کچھ خط بھی بھیجے، مگر میں نے پڑھے ہی ایک طرف رکھ دیئے اور پھر آٹھویں دن وہ خود میرے دفتر آ گئی۔ مَن افس میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی سیاہ چشمہ اس کے گورے چہرے پر پہرہ جمائے بیٹھا تھا۔ وہ بولی، تو اس کی آواز رندھی گئی، جیسے وہ بہت دیر روتی رہی ہو۔ ”آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ میں چلا اٹھا۔ ”آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ میری صورت کا مذاق ہی اڑانا تھا تو کوئی اور طریقہ اپنا لیتیں، مگر یہ مجسمہ.....“ وہ رو پڑی۔ ”میں آپ کا مذاق اڑانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی، بہت عزت کرتی ہوں میں آپ کی۔ آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میں نے تو بنا دیکھے ہی آپ کا ایک مجسمہ اپنے مَن میں بنا رکھا ہے۔“ میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ اس نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتارا۔ ”میں دیکھ نہیں سکتی..... ناہینا ہوں مَن.....“ ایک زوردار جھماکا سا ہوا اور میرے ارد گرد تمام کمرے میں اس کی بے نور آنکھوں کا اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد راما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زہر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر ریکروڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

پیاس کہتی ہے، اب ریت نچوڑی جائے
اپنے حصے میں سمندر نہیں آنے والا

میں سکتے زندہ سا بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور وہ روتی رہی۔ قسمت کے کھیل واقعی نرالے ہوتے ہیں۔ میرا بے وقوف دل مجھ سے آنکھ نہیں ملا پارہا تھا۔ صدیوں بعد جس ایک نظر پر اُسے اپنے ہونے کا گمان ہوا تھا، وہ نظر تو سدا کی بے نور تھی۔ اور میں نہ جانے کن خوش فہمیوں کا شکار ہو چلا تھا۔ ”میں آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکتا..... جانے غصے میں کیا کچھ کہہ گیا۔ میرے اندر کا چور تھا، جو چُپ نہیں رہ سکا۔“ یعنی نے سراٹھایا۔ ”آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں، میں نے آپ کو ہمیشہ آپ کے لفظوں کے آئینے میں دیکھا ہے۔ اور میں نہیں مانتی کہ اتنی خوب صورت سوچ رکھنے والا شخص بد صورت ہو سکتا ہے، دوبارہ ایسی بات کبھی نہ کہیے گا۔“ میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرے کہنے یا نہ کہنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ سچ وہی ہے، جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس داغ دار چہرے کا مجسمہ بنا تو جو بات آج تک صرف میرے ارد گرد والوں کے علم میں ہے، کل سارے شہر میں پھیل جائے گی، اور لوگ مذاق اڑائیں گے کہ یہ پری زاد کو کیا سوچھی؟“ یعنی نے اپنا چشمہ دوبارہ اپنی آنکھوں پر بھایا اور کھڑی ہو گئی۔ ”میں دیکھ نہیں سکتی، اپنی انگلیوں کی پوروں سے چیزیں مچھو کر انہیں مٹی کے مجسموں کے قالب میں ڈھالتی ہوں، مگر آپ کو دیکھنے کے لیے مجھے اپنی پوروں کی مدد کی ضرورت بھی نہیں پری زاد..... آپ کے لفظ خود آپ کا تعارف ہیں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”دل کے بہلانے کو، یہ خیال اچھا ہے۔ مگر میری تم سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو قراۃ العین۔“ وہ پلٹنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے رُکے۔ ”میں اپنی گیلری میں آپ کا انتظار کروں گی پری زاد.....“ وہ پلٹ کر چلی گئی اور میرے کمرے میں صرف اس کی خوشبو رہ گئی۔ آج میں نے پہلی بار اسے آپ نہیں، تم کہا، اور اس نے پہلی بار مجھے سر یا صاحب نہیں، صرف پری زاد کہہ کر پکارا تھا۔ یہ طرز خطاب اور القابات بھی تو ہمارے اندر کے بدلتے رویوں اور رشتوں کا ایک اظہار ہوتے ہیں۔ دل کی میٹھی بولیاں اپنے القاب خود طے کرتی ہیں۔

اگلی شام میں جھجکتے قدموں کے ساتھ یعنی کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گھر کے نچلے حصے میں یعنی اور اس کی ماں رہتی تھیں، جب کہ اوپر والا حصہ انہوں نے کسی چھوٹے خاندان کو کرائے پر دے رکھا تھا۔ یعنی کے والد کافی عرصے پہلے خالق حقیقی سے جا ملے تھے اور اب یہی کرایہ اُن ماں بیٹی کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں یعنی نے اپنے لیے ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری بنا رکھی تھی۔ مجسمہ سازی شروع کرنے سے پہلے یعنی نے اپنی نازک مہکتی انگلیوں سے میرے چہرے کو مختلف زاویوں سے ٹول کر دیکھا۔ ٹھنڈک اور بے پناہ سکون کا ایک سمندر اس کے پوروں کے لمس سے میرے سارے وجود کی گہرائیوں تک سرایت کر گیا۔ میری جھلکتی، تپتی روح کو جیسے ٹنک برف کا ٹھنڈا سا مل گیا۔ میری تمام عمر کی ریاضتوں کا حاصل۔ وہ اس کے ہاتھوں کا مہربان لمس..... یعنی نے کام شروع کر دیا۔ میں چُپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا، اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے مجسمہ بنانے میں تین چار دن لگیں گے۔ میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ تین چار صدیاں کیوں نہیں.....؟؟؟ میری زندگی میں وہ پہلی مدہوش تھی کہ جس خوش ادا کی اتنی قربت اور نزدیکی مجھے شرمندہ اور پریشان نہیں کر رہی تھی، کیوں کہ اتنے قریب موجود ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی طرح اُس کی نظریں میرے چہرے کے آ پار نہیں ہو رہی تھیں۔ نہ ہی مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی مخصوص طنز یہ مسکراہٹ ابھرتی تھی۔ عام طور پر جیسے ہی کوئی میری طرف نظر بھر کر دیکھتا، میری نظر اگلے ہی پل خود بخود جھک جایا کرتی، لیکن یعنی کے کوئل چہرے کو گھٹنوں دیکھتے ہوئے مجھے ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ مجھے اس سے نظر ملنے کا ڈر نہیں تھا۔ کتنی بڑی آزادی تھی یہ میرے لیے۔ یہ کوئی مجھ جیسوں سے پوچھے۔

ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے میں اگلے دن اور پھر شام ہونے کا انتظار کرتا رہا، جب مجھے دوبارہ یعنی کی گیلری پہنچنا تھا۔ صبح سے دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے پہروں کی طوالت پر شبہ ہونے لگا۔ یہ دن کو چار پہروں میں کیوں تقسیم کر دیا گیا ہے؟ پہلا پہر، دوپہر، سہ پہر اور پھر شام۔ کیا ضرورت تھی، بھلا وقت کو اتنے حصوں میں بانٹنے کی، بس صبح ہوتی اور شام ہو جایا کرتی، تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے مزید بے سرو پا خیالات میرے ذہن میں جالے بن رہے تھے، جب اچانک پی اے نے انٹرکام پر مجھے بتایا کہ میڈم شہ پارہ مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ میں شہ پارہ کو اپنے دفتر پا کر کچھ حیران سا تھا۔ میرے لیے وہ آج بھی وہی پرانی لٹی تھی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ”میں تم سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں پری زاد..... میرا فلمی کیریئر سینئر رحمان کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔ کیا تم میری سفارش کسی بڑے پروڈیوسر سے کر سکتے ہو؟ بڑی دھاک ہے تمہاری شہر میں، تم کہو گے تو میں پھر سے اپنے قدم جمانے میں کام یاب ہو جاؤں گی۔“ میں نے الجھن سے اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن میں تو کسی بڑے پروڈیوسر سے واقف بھی نہیں ہوں لٹی.....“ وہ مایوس ہو گئی ”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ جانے میں کس پریشانی میں بنا سوچے سمجھے یہاں چلی آئی۔ تمہارا کاروبار اور فلمی دنیا بالکل جدا ہیں۔“ وہ واپس جانے کے لیے پلٹی۔ میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ”ٹھہر لٹی! تم چاہو تو میں خود تمہاری فلم میں سرمایہ کاری کر سکتا ہوں۔ کتنے میں بن جاتی ہے ایک معیاری فلم.....؟؟“ وہ خوشی سے بے یقین ہو گئی۔ ”سچ، تم خود پروڈیوس کرو گے میری فلم۔ واہ..... اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے، مگر اس کاروبار میں آج کل نقصان کا زیادہ خطرہ رہتا ہے پری زاد، میں ڈرتی ہوں کہیں تمہاری رقم ہی نہ ڈوب جائے۔ تمہیں کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے فلم پروڈکشن کا.....“ میں نے مسکرا کر اس کی زلیب پریشان کے خم کو دیکھا۔ ”چلو اس بہانے رقم ڈوبنے کا قیمتی تجربہ تو حاصل ہو جائے گا ناں! تمہاری فلم کے بدلے یہ تجربہ بھی سہی۔ ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ فلمیں دل سے بنائی جاتی ہیں، دماغ سے نہیں، تو پھر دل کی سودوں میں نفع و نقصان کی فکر بھلا کیسی؟ دل کا ملوث ہونا ہی خسارے کی نشانی ہے۔“ لٹی کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے فرط جذبات میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں، میں تمہارا نقصان نہیں ہونے

دوں کی ہدی زادہ..... میں بہت محنت کروں گی، بہت زیادہ۔ میری زندگی کی سب سے یادگار پرفارمنس ہوگی اس فلم میں، میرے پاس ایک کہانی ہے، اگر تمہیں پسند آگئی، تو میں رائٹر سے کہانی پر کام کرنے کا کہہ دوں گی، مگر تمہیں وقت نکالنا ہوگا اس فلم کے لیے۔ میں تمہاری موجودگی میں بہت سہارا محسوس کروں گی۔“ لہٰذا چلی گئی اور میں شام کو کسی معمول کی طرح یعنی کی گیلری پہنچ گیا۔ اسے گیلی مٹی گوندھتے دیکھ کر نہ جانے مجھے ہر بار ایسا کیوں لگتا تھا، جیسے مٹی بھی اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوگی کہ کس کے ہاتھوں اس کا بُت بنے جا رہا ہے۔ اس شام ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کرتی ہیں، مگر اس کا انداز بیاں کس قدر جدا تھا۔ وہ جب رنگوں، خوشبوؤں، ڈھلتی شاموں اور راتوں کے طلسم کا ذکر کرتی، تو میں دم بخود سا بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے میں یعنی کے گھر سے نکلا تو ہوا تیز چل رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے جھنڈ حیرت سے اس نئے ہدی زادہ کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے، راستے ہی میں چند بوندوں نے فک کر میری گاڑی کی ونڈ اسکرین سے گاڑی کے اندر جھانکا اور مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کرتی، ہنسی ہوئی برستی بارش میں اپنی دوسری سہیلیوں سے جا ملیں۔ کبیر خان حسب معمول چوکتا سا ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا درگزر پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اتنے میں لہٰذا کا نمبر میرے سیل فون پر جگمگانے لگا۔ ”ہدی زادہ..... کہاں ہو تم؟“ ”اجنبی شہر کے اجنبی راستے..... اور میں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”اسٹوڈیو آسکتے ہوا بھی۔ مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔“ میں نے کبیر خان کو اسٹوڈیو چلنے کو کہا۔ ہم ویران سے فلم اسٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچے تو چند عجیب سے حلیے والی عورتیں اور مرد ہمیں اندر گھومتے نظر آئے۔ عجیب سی اُداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی سارے ماحول پر، جیسے کوئی سوگ برپا ہو۔ ہم ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے، تو وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ کبیر کا حلیہ اور کاندھے سے لٹکا ہوا پتل دیکھ کر وہ سب کچھ جزبہ سے ہو گئے۔ میں نے کبیر کو باہر انتظار کرنے کو کہا۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر ہی جما کھڑا رہے گا۔ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ لہٰذا نے ڈائریکٹر اور باقی لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ ایک جانب کونے میں ایک بوڑھا شخص

ہارمونیم سامنے رکھا بیٹھا تھا اور اس کی آڑ میں کئی سٹائی ایک شرمیلی سی لڑکی، چھوٹی موٹی سی بنی بیٹی تھی، جو اس دفتر کے ماحول سے بالکل میل نہیں کھا رہی تھی۔ باقی لوگوں کی چہیتی ہوئی نظریں لڑکی کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں، مگر میرے آتے ہی ڈائریکٹر نے فالتو عملے کو باہر بھیج دیا، تو لڑکی کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہو گیا، مگر ابھی تک وہ وہیں دبی بیٹی تھی۔ لہٰذا نے مجھے بتایا کہ وہ عمر رسیدہ شخص استاد بنے خان ہے، مشہور موسیقار اور اس کے پہلو میں کئی ہوئی لڑکی سنبھل ہے، استاد بنے خان کی بیٹی اور آج وہ دونوں لہٰذا کی آنے والی فلم کی ڈھنوں پر کام کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ڈائریکٹر ایک پکٹی عمر کا تیز طرار سا بندہ تھا، جسے فلم ملنے کی بے حد خوشی تھی، لیکن کہیں اندر سے کوئی بے یقینی بھی اسے کھائے جا رہی تھی۔ ”بس ہدی زادہ صاحب! کیا بتاؤں آپ کو، کبھی یہی فلم اسٹوڈیو تھا کہ چوبیس گھنٹے کام کی شفٹ چلتی رہتی تھی، کہیں ندیم صاحب، تو کہیں محمد علی صاحب۔ کہیں شاہد تو کہیں وحید مراد، کوئی نہ کوئی شوٹنگ جاری رہتی تھی۔ یہ جو فوارہ آپ نے نیچے دیکھا ہے ناں، یہاں تو بہ یک وقت تین تین گانے شوٹ ہوا کرتے تھے۔ بس پھر نہ جانے کیا ہوا، سب برباد ہوتا چلا گیا۔ اب تو سال بھر میں ایک آدھ فلم بنتی ہے، اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ سیکڑوں کاری گراوران کے خاندان بے روزگار ہو گئے۔“ وہ مزید ہناؤ کے یونہی بولتا رہتا، اگر لہٰذا اسے اشارہ کر کے روک نہ دیتی۔ لہٰذا ہی کے کہنے پر ڈائریکٹر نے مجھے فلم کی کہانی سنائی، بنیادی پلاٹ محبت کی کہانی پر مرکوز تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین یا چار کہانیاں ہی پائی جاتی ہیں۔ باقی ساری کہانیاں انہی کہانیوں سے جنم لیتی ہیں اور مجھے یہ پڑھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی، تین چار کی جگہ اگر صرف ایک محبت کی کہانی ہوتی، تو بھی اس کائنات کے لیے کافی تھی۔ درمیان میں ڈائریکٹر ہمیں گانے کی پچویشن اور مقام بھی بتاتا رہا اور کہانی کے اختتام کے بعد استاد بنے خان اپنا ہارمونیم اٹھائے کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے۔ سنبھل بھی استاد کے ساتھ سٹ کر بیٹھ گئی اور استاد نے راگ چھیڑ دیا۔ لڑکی کی آواز واقعی سُر ملی تھی اور گلے میں بلا کالوچ تھا۔ وہ گانے کے دو بول دہراتی اور پھر گھبرا کر میری طرف اپنی ہر نی جیسی آنکھیں اٹھا کر دیکھتی کہ میں دل چسپی لے رہا ہوں یا نہیں۔ فن کو ہمیشہ سٹائش کی تمنا رہتی ہے اور شاید فن کار کو اپنے قدردانوں کی نظریں پڑھنے کا فن آتا ہے۔ ”جب بارش کی پہلی بوند گرے..... تم چلے آنا..... میرا سند یہ ملے نہ ملے..... تم چلے آنا.....“ باہر برستی بارش کے جلتے رنگ کے ساتھ مل کر استاد بنے خان کے سُر اور سنبھل کی ریلی آواز ایک عجیب سا ماحول پیدا کر رہے تھے۔ استاد نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹی نے بی۔ اے کر لیا ہے، مگر اب وہ اسے اپنے آبائی فن سے متعارف کروانا چاہتا ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ شہ پارہ بیگم نے انہیں اپنی نئی فلم میں موقع دینے کا وعدہ کیا ہے، مگر یہ سب میری منظوری پر منحصر ہے۔ استاد کسر نفسی کا پیکر تھا اور اس کی اور بیٹی کی خستہ حالی، ان دونوں کی حالت بھی پوری طرح بیان کر رہی تھی۔ مجھے وہ ایک وضع دار شخص لگا، جسے یقیناً کسی بہت بڑی مجبوری نے یوں بیٹی کو فلم انڈسٹری کے ماحول میں بطور گلوکارہ متعارف کروانے پر اکسایا ہوگا۔ جب استاد نے لاجت سے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے ان باپ بیٹی کا فن پسند آیا، تو میرے لب کپکپا سے گئے۔ ”یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے سُنا بھی نہیں آتا۔ میں بھلا آپ کے فن کی جانچ کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ کی ریاضت اور محنت نے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ کوئی ہنرمند ہی آپ کو صحیح داد دے سکتا ہے۔“ استاد بنے کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ لہٰذا نے موضوع بدل دیا۔ ”آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئے ماسٹر جی..... ہدی زادہ صاحب کی یہ پہلی فلم ہے۔“ استاد بنے نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا ”ہاں، پر ادب والے ہیں۔ شاید اسی لیے آج اس مقام پر ہیں۔“ میں نے لہٰذا سے دبے لفظوں میں دوبارہ کہا کہ وہ فلم سے متعلق تمام فیصلوں کی مختار ہے۔ مجھے ان کھینڑوں سے دور ہی رکھے، مگر وہ نہیں مانی اور اگلی رات کے لیے پھر سے فلم کی دوسری بیٹھک رکھ دی گئی۔ ہم لوگ چائے پی کر رخصت ہوئے تو گیٹ کے قریب میں نے استاد بنے اور سنبھل کو سڑک کنارے انتظار کرتے دیکھا۔ میں نے شیشہ نیچے کر کے پوچھا تو پتا چلا کہ رکشے یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ان کے لاکھ انکار کے باوجود میں نے انہیں گاڑی میں بٹھالیا۔ بارش تیز تر ہو چکی تھی۔ ہماری گاڑی اندرون شہر کی چند تاریک گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک پرانے محلے کے بوسیدہ سے لکڑی کے پھانک نما گیٹ پر جا کھڑی ہوئی۔ استاد نے بہت اصرار کیا کہ میں ایک کپ چائے پی کر جاؤں، مگر میں نے معذرت کر لی۔ اس کی بیٹی نے بھی دبے لفظوں میں مجھے گھر آنے کا کہا۔ میں نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ دونوں ہماری گاڑی نکلنے تک وہیں کھڑے رہے۔

اگلی شام میں ٹھیک چار بجے یعنی کی گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا، جیسے ایک پڑھا کو بچہ ٹھیک وقت پر اپنی جماعت میں پہنچ کر سبق سُنانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ میں نے یعنی کو فلم کے بارے میں بتایا تو خوشی سے چلائی۔ ”فلم..... واہ..... ہدی زادہ میں آپ کی فلم کی آرٹ ڈائریکٹریں ہوں گی۔ ساری سجاوٹ میری طے کردہ ہوگی، ہر سیٹ پر میری بنائی ہوئی مورتیاں ہوں گی، ٹھیک.....؟“ ”ہاں ہاں، ٹھیک ہے، مگر پہلے میرا مجسمہ تو مکمل کر دو۔ کہیں اس فلم کے جھیلے میں ہمارا کام ہی نہ رہ جائے۔“ وہ میری بات سُن کر زور سے ہنس پڑی۔ سنا نے میں یک لخت بہت سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ میں سحر زدہ سا بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ زندگی بس اسی دورانیے کا نام ہوتی، تو کتنا اچھا ہوتا، مگر ہر اچھے وقت کی طرح یہ پل بھی پل بھر میں کٹ گئے اور مجھے اٹھنا پڑا۔ واپسی پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹوڈیو کی طرف موڑنے کا کہا تو کبیر اپنے چہرے کے تاثرات چھپا نہیں پایا۔ ”صاحب! اجازت دو تو ایک بات

بولے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہاں بولو۔۔۔۔۔؟“ وہ اگلی سیٹ پر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ذرا سا کسمپاسا ”صاحب! یہ فلم اسٹوڈیو کا علاقہ محفوظ نہیں ہے۔ ہزار دوست، ہزار دشمن ہوتا ہے بندے کا۔۔۔۔۔“ میں نے چونک کر کبیر کی طرف دیکھا۔ وہ تبھی اپنی زبان کھولتا تھا، جب اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے شہر میں بہت سوں کی ترقی رک چکی تھی۔ ہر بڑا اینڈر میرے نام کھل رہا تھا۔ میری دولت کا مقناطیس اپنے جو بن پر تھا، جو مایا کا کوئی بھی ذرہ اپنے سے دور جانے نہیں دیتا تھا اور یقیناً یہ بات بہت سوں کو کھلتی بھی ہوگی۔ گاڑی اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی تو حسب معمول چند آوارہ کتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈائریکٹر کے کمرے میں نشست جمی ہوئی تھی۔ استاد بٹے اور سنبل نے تیار کردہ دھنوں پر کچھ گیت گنگنائے۔ مگر مجھے شاعری کچھ عامیانہ سی لگی۔ لہٰذا نے میری بے چینی بھانپ لی۔ ”پڑی زاد۔۔۔۔۔ تم خود کیوں گیت نہیں لکھتے اپنی فلم کے لیے؟“ سنبل نے شاعری کے ذکر پر چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے

جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں نہیں، مجھے فلمی شاعری کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم کسی مستند فلمی شاعر سے گیت لکھوالیں۔“ سنبل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور جھجک کر بولی۔ ”اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہمارے محلے میں ہی ایک بہت اچھے شاعر رہتے ہیں۔ دنیا داری سے نا تانہیں، مگر ضرورت مند بھی ہیں، ہو سکے تو۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ ڈائریکٹر نے منہ بنایا ”دیکھ لیں گے اُسے بھی، کون سا ساحر لدھیانوی یا مجروح سلطان پوری بچھا بیٹھا ہے اس کے اندر؟“ لہٰذا نے شاعری میں دیر کی وجہ سے کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بٹے خان سے کہا کہ ہم ابھی چل کر مل لیتے ہیں اس شاعر سے، ڈائریکٹر بھولا سا گیا۔ ”ارے کیا بات کرتے ہیں سرجی۔۔۔۔۔ آپ کیوں جائیں گے، وہ خود آئے گا یہاں۔“ میں نے اس کی سُنی اُن سُنی کر دی۔ ہم اسٹوڈیو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک چند لوگ ”شاہ جی۔۔۔۔۔ شاہ جی“ کہتے ہوئے ایک خوش لباس شخص کی طرف لپکے، استاد بٹے نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ شخص بہت گرم جوش اور عزت سے بٹے خان سے ملا۔ گاڑی آگے بڑھی، تو بٹے خان نے مجھے بتایا۔ ”یہ سید نور صاحب ہیں۔۔۔۔۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری اب بس انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ آج کل بڑی اچھی فلم بن رہی ہیں، مجاجن۔“ گاڑی بٹے خان کے اندر چلے گئے۔ سنبل اور بٹے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے بیٹی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ چند گلیاں گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹے سے کچے مکان کے آگے رُک گئے۔ دستک کے جواب میں اندر سے کسی نے لرزتی آواز میں کہا ”اندر آجائیے صاحب، مزاروں کے دروازوں پر دستک نہیں دی جاتی۔“ میں، سنبل اور بٹے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے برآمدے کے سامنے بنے واحد کمرے کے اندر لائٹن کی کم زوری روشنی نے ٹیالا اُجالا پھیلا رکھا تھا۔ بٹے اور سنبل کو دیکھ کر میزبان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی ”کبھی ہم خود کو، کبھی گھر کو دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔“ بان کی جھلنگ سی چار پائی پر لیٹا وہ کم زور سانو جوان اٹھ بیٹھا۔ ”معاف کیجیے گا، کمرے میں ایک ہی کرسی ہے لہٰذا۔۔۔۔۔“ وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا، مگر میری نظریں اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی میری چھتی نظریں محسوس کر کے میری جانب متوجہ ہو گیا۔ اور پھر اس کی حالت بھی مجھ جیسی ہی ہو گئی اور وہ بے تابی سے کھڑا ہو گیا اور لپک کر مجھے شانے سے پکڑ کر سرسراتی آواز میں بولا ”پڑی زاد۔۔۔۔۔ یہ، یہ تم ہی ہونا۔۔۔۔۔“ میری آنکھیں نم ہونے لگیں ”کیوں۔۔۔۔۔؟ یہ چہرہ دیکھ کر بھی نہیں پہچانتا کیا، صرف لباس و حلیہ بدلا ہے میرا۔ مقدر وہی لیے پھر رہا ہوں ناساز۔۔۔۔۔“ وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ کہاں چلا گیا تھا یا ر! اپنے دوست کو بھی بھلا دیا۔“ بٹے خان اور سنبل حیرت زدہ اور پریشانی سے ہم دونوں کو گلے مل کر روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہاں وہ ناساز ہی تھا۔ میرے کالج کے دور کا واحد دوست، جس نے میرے اندر تجھی شاعری کی چنگاری کو ہوادے کر شعلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ سنبل نے جھجکتے ہوئے ناساز سے کہا ”آپ انہیں جانتے ہیں، یہی فلم کے پروڈیوسر ہیں پڑی زاد۔۔۔۔۔ اور میں نے ان ہی کی فلم کے لیے نغمہ نگاری کرنے کو کہا تھا آپ سے۔۔۔۔۔“ ناساز حیرت سے مجھے ٹول ٹول کر دیکھتا رہا، ”یہ کیا انقلاب ہے پیارے، سب فتح کر لیا کیا میرے شہسوار؟ تو تو واقعی فاتح نکلا۔“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ”نہیں۔۔۔۔۔ اب بھی ہار رہا ہوں، بس سونا چاندی جمع ہوتا جا رہا ہے زار راہ کے طور پر، دل اتنا ہی ویران اور ناکارہ ہے اب تک۔“ وہ زور سے ہنسا ”یہ تمہی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔۔۔۔۔“ بٹے خان اور سنبل ہمیں باتوں میں مصروف دیکھ کر گھر سے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔ ناساز کے گھر کی حالت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پاس شاید چائے کے پورے برتن بھی نہ ہوں۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ کم زور اور لاغر لگ رہا تھا۔ وہ غور سے میری داستان سُنا رہا۔ اس کے آس پاس دواؤں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔ ”یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے ناساز۔۔۔۔۔ کالج کا سب سے خوش پوش اور زندہ دل لڑکا یوں بستر سے لگا پڑا ہے۔ سب خیر تو ہے نا۔۔۔۔۔“ وہ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یاد ہے، کالج کے دور میں ہم نے چھپ کر ہاسٹل میں وی سی آر پر فلم دیکھی تھی ”نمک حرام“ اس میں وہ شاعر والا گیت ہم دونوں کتنا گنگنایا کرتے تھے۔“ میں شاعر بدنام۔۔۔۔۔ میں چلا۔۔۔۔۔ محفل سے ناکام۔۔۔۔۔ میں چلا۔۔۔۔۔ تو بس یار۔۔۔۔۔ یہ شاعر جو ہوتے ہیں نا، یہ محفل سے ناکام ہی چلے جاتے ہیں۔“ میں نے اسے غور سے دیکھا ”اور یہ پھولوں جیسی لڑکی سنبل، یہ اس شاعر ناکام کی کیا لگتی ہے؟“ اس نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ”پگلی ہے، مزاروں کے در کھٹکھٹاتی رہتی ہے۔ اب دیکھو، جہیں پکڑ لائی ہے اور یہ تم ہی تھے کہ آگئے، کوئی روایتی فلم پروڈیوسر ہوتا تو کبھی نہ آتا۔“ اتنے میں باہر صحن کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ناساز کو لینے رہنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل کر دروازہ کھولا تو سنبل چائے کے لوازمات لیے کھڑی تھی۔ ”آپ نے یہ سب تکلف کیوں کیا؟ میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں سنبل۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ اسے بچالیں پڑی زاد صاحب، آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں۔ ہمارا واحد سہارا اب آپ ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا ہونا ناساز کو۔۔۔۔۔“ سنبل کی آنکھیں چٹک پڑیں ”اسے کینسر ہے، اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آخری اسٹیج پر ہے اس کا کینسر۔۔۔۔۔“ میرے پیروں تلے زمین یک دم سرک گئی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، منکک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کٹھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زہر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سنبل چائے رکھ کر کمرے سے باہر نکلی، تو میں نے ناساز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”چلو میرے ساتھ، اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ دنیا کے کسی کونے میں بھی، جہاں تمہارا علاج ممکن ہو، تمہیں وہاں پہنچانا اب میری ذمہ داری ہے۔ اشو، جلدی کرو۔“ ناساز نے مجھے کھینچ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ ”بہت دیر ہو چکی ہے پری زاد..... اب مجھے یہیں رہنے دو۔ یہ کمرہ، یہ تنہائی اب یہی میری سنگت ہے، اور پھر یہاں وہ لگی بھی تو ہے ناں..... مجھے ان سب کے ساتھ رہنے دو۔“ میں نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا، ساری زندگی دوسروں کو جینے کا درس دیتے رہے اور آج خود زندگی سے بھاگ رہے ہو، ایسا کیوں کر رہے ہو میرے یار.....؟“ ناساز نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ”زندگی خود مجھ سے دامن مٹھوانے کی فکر میں ہے پیارے، میں ہی ڈھیوں کی طرح اس کے دامن سے لپٹا ہوا ہوں۔ ہاں، اب اگر مرنے بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں۔ میرے جانے کے بعد تم سنبل کا خیال رکھو گے ناں پری زاد.....“ میں نے واپس پلٹنے سے پہلے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا۔ ”کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں تمہیں کچھ ہونے نہیں دوں گا میرے شاعر بدنام، کل تیار رہنا۔ تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔“ ناساز نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور شرارت سے بولا۔ ”تشخیص بجا ہے، کہ مجھے عشق ہوا ہے..... نئے میں لکھوان سے ملاقات مسلسل“

اگلے روز یعنی کی گیلری میں بھی میرا دھیان ناساز کی طرف ہی لگا رہا۔ یعنی نے حتی طور پر چند زاویے درست کیے اور مجھے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ”بس جناب، ہو گیا مکمل۔“ اس کی آواز سے جوش چمک رہا تھا۔ ”بتائیں ناں پری زاد۔ کیسا بنا ہے آپ کا اسکرپچر.....؟“ میں اپنے خیالات کی دنیا سے چونک کر پلٹا۔ اور پھر میری نظر یعنی کے بنائے مجھے پر پڑی تو آنکھیں گھٹی کی گھٹی رہ گئیں۔ میں بے اختیار اٹھ کر مجھے کے قریب آ گیا۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں، اتنا بے داغ، خوب صورت، مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ، ایسا چہرہ تو میں نے کبھی آئینے میں نہیں دیکھا تھا۔ یعنی میری حالت سے بے خبر اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی ”میں اپنی پوروں کی آنکھوں سے آپ کو ایسا دیکھتی ہوں پری زاد..... بتائیں ناں، کتنا قریب تر ہے یہ آپ سے، آپ پُپ کیوں ہیں، بولتے کیوں نہیں، کیا میں نے بہت بُرا بنایا ہے۔ کچھ تو بولیں، پلیز.....“ وہ پریشان سی ہو گئی۔ میری آواز کی لرزش خود میرے لیے بھی اجنبی تھی ”نہیں، تم نے دنیا کا سب سے خوب صورت چہرہ تراشا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ پیاری لڑکی میں تو وہ ہوں، جسے دیکھ کر آئینے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، سرسراتی ہوائیں گھبرا کر تھم جاتی ہیں، سورج مدہم پڑ جاتا ہے اور چاند کی چاندنی تپتی کرنیں برسانے لگتی ہے۔ وہ تڑپ کر میرے قریب آ گئی۔ ”ایسا کیوں کہتے ہیں آپ، میری انگلیوں کی پوریں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، یہ میرے مَن کی تصویر مٹی کے قالب میں ڈھالتی ہیں، سچ بتائیں، اس چہرے کے خدو خال آپ کے چہرے جیسے نہیں ہیں کیا.....؟“ میری آواز بھڑا گئی۔ ”ہاں بلاشبہ، خدو خال، نقوش، آنکھیں سب میرے چہرے سے مشابہ ہیں، مگر جو ٹور، حُسن و وجاہت تمہاری پاکیزہ انگلیوں کی کاری گری نے اس مجھے میں منتقل کر دی ہے، میرے پاس ایسی کوئی روشنی، کوئی حُسن نہیں۔“ وہ رو پڑی۔ کاش میں اسے یہ بات سمجھا سکتا کہ دنیا اس کے کول مَن کی آنکھوں سے نہیں دیکھتی۔ دنیا بڑی ظاہر پرست ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آج میں اتنا اُداس کیوں ہوں۔ میں نے اسے اپنی اور ناساز کی دوستی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کس خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ یعنی نے ناساز سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میں شام ڈھلے اس کے گھر سے واپسی پر اُسے بھی اپنے ساتھ ناساز کے گھر لے آیا۔ ناساز نے یعنی کو میرے ساتھ دیکھا، تو حسبِ عادت مصرع اس کے ہونٹوں سے پھسل گیا ”سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں.....“ میں نے اُن دونوں کا تعارف کروایا۔ ناساز نے شرارت سے میری طرف دیکھا ”سو، اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں.....“ میں نے اسے گھور کر دیکھا ”باز آ جاؤ، یعنی تم ہی اسے سمجھاؤ کہ اپنی ضد چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلے۔ دنیا کی کوئی بھی بیماری لا علاج نہیں ہوتی۔ کوشش کرنا تو ہمارا فرض ہے۔“ یعنی اور ناساز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناساز نے فلم کے لیے لکھے اپنے نغمے یعنی کو سنائے۔ کچھ دیر بعد سنبل بھی آ گئی اور حسبِ معمول دو لڑکیوں کے اکٹھے ہوتے ہی باقی ساری باتیں پس منظر میں چلی گئیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں ایسی گم ہوئیں کہ باقی سب بھول گئیں۔ کہتے ہیں، دو لڑکیاں جب پہلی بار ملتی ہیں تو عموماً ڈھائی تین گھنٹے کی تعارفی ملاقات کے بعد ایک دوسرے سے ان کا پہلا سوال ہوتا ہے ”ویسے تمہارا نام کیا ہے.....؟“ وہ دونوں بھی برآمدے میں بیٹھی شاید ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہی تھیں۔ ناساز سرک کر میرے قریب آ گیا ”تم تو بڑے چُپے رستم نکلے پری زاد پیارے..... ایسی پری ساتھ لیے پھرتے ہو کہ جس کی پہلی جھلک ہی دھڑکنیں روک دے۔ اور پھر بھی کہتے ہو کہ دل ابھی ویران ہے۔“ میں نے دُکھ سے باہر بیٹھی یعنی کی طرف دیکھا۔ ”وہ دیکھ نہیں سکتی، اس لیے میرے ساتھ ہے، ورنہ دوسروں کی طرح یہ رشتہ بھی تھخیک یا ہمدردی کے قالب میں ڈھل جاتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں خود اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اس کے ساتھ چل کر میں نہ صرف خود کو بلکہ اس معصوم، اُن جان لڑکی کو بھی لوگوں کے مذاق کا باعث بن رہا ہوں۔“ ناساز میری بات سُن کر خاموش سا ہو گیا ”میں باقی ساری دنیا کی طرح یہ کہہ کر تمہارے زخموں پر نمک نہیں چھڑکوں گا کہ دولت ہر مرض کا علاج ہے، لیکن تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ اگر تم اپنے اندر کی اس آواز کو دبائیں سکتے، تو پھر اپنا چہرہ بدل ڈالو۔ آخر کب تک خود کو اسے اُن دیکھے عذاب کی بھٹی میں جھونکے رکھو گے؟“ میں نے چونک کر ناساز کی جانب دیکھا ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ آج کل کیا ممکن نہیں، صرف جیب میں دمڑی ہونی چاہیے، جو ماشاء اللہ اب تمہارے پاس بہت ہے۔ کہیں بھی بیرون ملک جا کر پلاسٹک سرجری کروالو۔ آج کل تو ساری دنیا کو چہرہ بدلنے کا خط سوار ہے۔ اچھے خاصے لوگ علاج کے بہانے اپنے چہرے کی نوک پلک سنوارنے کے لیے پلاسٹک سرجری کروا لیتے ہیں۔ تو پھر اگر تم بھی اپنی جون بدل لو گے، تو بھلا کون سی قیامت آ جائے گی۔ اتنے میں وہ دونوں اندر چلی آئیں اور ناساز نے بات بدل دی۔

رخصت ہوتے وقت ناساز نے یعنی سے کہا ”سٹو لڑکی، آج میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں، جو آج سے پہلے تمہیں شاید کسی نے نہ بتائی ہو۔ تمہاری آنکھیں دنیا کی سب سے خوب صورت آنکھیں ہیں۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ جلد ہی یہ آنکھیں اس دنیا کے سارے رنگ دیکھ سکیں گی۔“ یعنی کی پلکیں نم ہو گئیں اور ہم وہاں سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ لیکن میرا دھیان ساری رات ناساز کی پلاسٹک سرجری والی بات میں الجھا رہا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے، پیدائش سے لے کر آج تک مجھے جن عذابوں کا سامنا رہا ہے، وہ سب الجھنیں، کرب اور عذاب ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو جائیں گے کیا؟ مگر عُمر بھر کی شناخت

بدلتا تو کچھ آسان نہیں۔ جو لوگ اس پڑی زاد کو جانتے ہیں، وہ ایک نئے اور اُبلے چہرے والے پڑی زاد کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیں گے۔ ساری رات نہ جانے ایسے کتنے بے سرو پا خیالات میرے خالی دماغ میں کھٹکھٹاتے رہے۔

جانے کب صبح ہوئی اور کب سورج نے میری کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دھوپ کا سلام بھیجا۔ دفتر پہنچا تو کمالی میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے چھوٹے ہی شکوہ کیا۔ ”یہ کیا سر جی! آپ نے اتنی بڑی فلم شروع کر دی، اور مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی۔“ کمالی کے ہاتھ میں صبح کا اخبار دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ تو یہ خبر پھپ گئی، یہ اخبار والے جانے اتنی جلدی کیسے اُڑتی چڑیا کے پُر گن لیتے ہیں۔ ابھی تو صرف منصوبہ ہی بنا تھا۔“ کمالی نے جوش میں اندرونی صفحہ کھولا ”شہ پارہ بیگم کا پورا انٹرویو چھپا ہے سر! ساری فلم انڈسٹری ہلا کر رکھ دی ہے آپ نے، کبھی مجھے بھی بہت شوق تھا فلموں میں کام کرنے کا۔ آہ، مگر اب تو فلم دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔“ میں کسی اور خیال میں گم بیٹھا تھا۔ کمالی اپنی دُھن میں بولے گیا ”اس دن آپ نے مجھ سے پوچھا تھا نا سر کہ شادی کے اتنے سال بعد بچے اور گھربار کے مسائل کے ہجوم میں ہماری محبت کہاں کھو جاتی ہے، تو بات صرف محبت کی نہیں ہے۔ ہم وقت کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی باقی حسرتیں اور خواہشیں بھی مٹی کر دیتے ہیں اس غم دوراں کی آندھی میں۔ اب یہی فلم ایکٹربنے والی خواہش ہی لے لیں میری۔ کاش! میں شادی کے چکر میں اس آرزو کا گلا نہ گھونٹتا۔“ کمالی باقاعدہ غم گین ہو گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جانتے ہو کمالی، دنیا کا سب سے ناکام آدمی کون ہوتا ہے، وہ، جو اپنے ماضی کے کیے گئے فیصلوں کو یاد کر کے حال میں خود کو کوسے۔ تم نے اُس وقت وہی فیصلہ کیا، جو تمہارے دل نے بہتر جانا۔ تب تمہاری محبت ہی تمہاری ہر خوشی کا حاصل تھی۔ اگر اُس وقت تم فلم انڈسٹری جوائن کر لیتے تو شاید آج ایک نام ور آرٹسٹ کہلاتے، مگر یقین کرو، اپنی محبت کھودینے کی کسک تمہیں آج زیادہ غم گین رکھتی۔ جسے تم نے پالیا، بس وہی تمہارا نصیب ہے، باقی سب سراب ہے۔“ کمالی نے اثبات میں سر ہلایا ”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر، مگر پھر یہ پایا ہوا نصیب اپنی کشش کیوں کھودیتا ہے۔ لا حاصل ہی ہمیشہ پُر کشش کیوں رہتا ہے؟“ میں نے لمبی سانس بھری ”شاید اس لیے کہ انسان سدا کا ناٹھکر ہے۔ اور رہی بات محبت کی، تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے، اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب رفتہ رفتہ ہماری محبت، شفقت میں بدل جاتی ہے۔ محبت، محبت، نہیں رہتی، ایک گہری شفقت بن جاتی ہے۔“ کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”شفقت..... میں سمجھا نہیں سر۔“ ”ہاں کمالی، شفقت، ہماری محبت کہیں کھوتی نہیں ہے۔ بس کسی اور جذبے میں ڈھل جاتی ہے۔ اور ہم باقی ساری زندگی اس شفقت ہی کو محبت سمجھتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہماری زندگی میں کسی نئی محبت کے لیے جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اور یوں ہماری زندگیوں میں نئی محبتوں کا ڈاکا ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جاؤ کمالی، اپنی بیوی بچے کو اپنا پورا وقت دیا کرو۔ کیوں کہ کبھی کبھی شفقت کا قرض محبتوں کے ادھار سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔“ کمالی پُپ چاپ دفتر سے نکل گیا۔

دو پہر کو لٹنی کا فون آیا، تو میں نے اسے خوش خبری سُنائی کہ نا ساز نے فلم کے سارے گیت لکھ کر استاد بٹے خان کے حوالے کر دیے ہیں۔ میوزک بھی تقریباً مکمل ہو چکا تھا، لہذا اگلے ہفتے فلم کی ساری موسیقی ترتیب دے دی گئی۔ سنبل نے مجھے بتایا کہ اس نے مہینوں بعد نا سازی کی آنکھوں میں خوشی کی گچی لہر دیکھی، جب اس نے اپنی شاعری پر سنبل کی آواز کا جادو دیکھتے سنا۔ لٹنی کی خواہش تھی کہ فلم کے گانے کینیڈا یا یورپ کے کسی حسین مقام پر فلم بند کیے جائیں۔ فلم کی کاسٹنگ مکمل ہو چکی تھی اور اب صرف شوٹنگ کا مرحلہ شروع ہونا باقی تھا۔ میں دن بھر غیر محسوس طور پر طب کے رسالوں اور انٹرنیٹ پر دنیا کے بہترین پلاسٹک سرجنز کی تفصیلات کھوجتا رہتا تھا۔ میرے دفتر کی الماریوں اور میز کے خفیہ دراز اب ایسی معلومات سے بھرے رہتے تھے، مگر یہ سب کچھ میں اس طرح پُچھ کر کر رہا تھا، جیسے کوئی چور، چوری کرتا رہا۔ پہلے مجھے ہمیشہ یہ خوف اور فکر دامن گیر رہتی تھی کہ لوگ میری صورت کا مذاق اُڑائیں گے اور اب جب ایک راستہ دکھائی دیا تھا تو یہ ڈر دامن سے لپٹا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے.....؟ ہماری زندگی کے نوے فی صد معاملات کی الجھن اسی ایک جملے ہی میں توپناں ہے کہ زمانہ کیا کہے گا.....؟ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہم زیادہ تر اُن ہی لوگوں کی باتوں کی فکر میں گھلے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے درحقیقت ہماری زندگی اجیرن ہوتی ہے۔

اگلی شام میں عینی کے گھر پہنچا، تو وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن کے لیے نکل چکی تھی۔ میں واپس پلٹنے لگا، تو اس کی والدہ نے مجھے چائے کے لیے روک لیا، کمرے میں چاروں جانب میڈیکل رپورٹس اور آنکھوں سے متعلق دنیا کے کچھ مشہور اسپتالوں کے کتابچوں کا انبار سا لگا تھا۔ عینی کی والدہ نے بتایا کہ عینی سات سال کی عُمر تک بالکل ٹھیک تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دھیرے دھیرے اس کی بینائی جاتی رہی۔ اُس وقت عینی کے والد زندہ تھے اور انہوں نے اپنی ہی سر ممکن کوشش کر دیکھی، مگر عینی کی بینائی واپس نہ آسکی۔ پھر کئی سال بعد بات یہاں تک پہنچی کہ اگر عینی کے گروپ سے مشابہت رکھتا ہوا لینز (قرنیہ) مل جائے تو عینی کی بصارت واپس آسکتی ہے۔ عینی کی والدہ نے دنیا بھر کے طبی اداروں کو اپنی بیٹی کے کیس کی تفصیلات بھجوا رکھی تھیں اور اب مہینوں سے اس جواں ہمت خاتون کا کام بس یہی تھا کہ وہ عینی کے آنکھوں کے قریب کی تلاش کے لیے دنیا بھر میں خط و کتابت کرتی رہتی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ اللہ نے چاہا تو جلد ہی ان کی تلاش، رنگ لائے گی۔ عینی کے گھر سے نکلتے وقت میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اگر عینی کی بینائی میری سرجری سے پہلے واپس آگئی تو وہ مجھے دیکھ کر کیا سوچے گی۔ اس کے مُن نے میری جوشبیہ تراشی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ ایک چھنا کے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے گی۔ کاش! اس ساری دنیا میں کسی کی آنکھیں ہی نہ ہوتیں اور ہم سب اپنی انگلیوں کی پوروں سے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر جہاں ”کاش“ آجائے، وہاں آخر میں صرف ایک ”آہ“ رہ جاتی ہے۔ میں نے بھی ایک لمبی آہ بھری۔ کچھ بھی ہو، مجھے کسی بھی صورت عینی کی بصارت واپس آنے سے پہلے اپنی سرجری کروانی ہوگی، مجھے اپنے چہرے کو عینی کے بنائے ہوئے جیسے کی شبیہ میں ڈھالنا ہوگا تا کہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھے تو میں اُسے اُسی طرح نظر آؤں، جیسا وہ مجھے محسوس کرتی ہے۔ گاڑی تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور میرے اندر میرے اپنے ہی متضاد خیالات کی ایک ایسی یلغار جاری تھی، جس نے مجھے پوری طرح نڈھال کر کے رکھ دیا۔ وہ پوری رات عجیب کرب میں گزری اور پھر، تنگ آ کر میں نے انٹرنیٹ سے جمع شدہ معلومات کے مطابق پلاسٹک سرجری کے تمام اداروں کو ای میلز کر دیں، جن میں اپنی تازہ ترین تصاویر اور باقی تمام جزئیات بھی تحریر کیں۔ دوسرے دن ہی سے مجھے مختلف اداروں سے جوابات موصول ہونا شروع ہو گئے اور تین دن بعد ان جوابات کے انبار میں سے مجھے اپنے مطلب کے ادارے کا انتخاب کرنا آسان ہو گیا۔ ٹورنٹو کے ایک طبی ادارے نے پلاسٹک سرجری کے لیے جو لوگو ڈیزائن کیا تھا، اس پر لکھی ایک سطر نے مجھے اسے چُننے پر مجبور کر دیا۔ جس کی تحریر کچھ یوں تھی ”ہم چاہے تقدیریں نہ بدلیں، مگر چہرے بدل دیتے ہیں۔“

میں نے پائن ہل (Pine Hill) نامی اس پلاسٹک سرجری کے ادارے کی تمام تفصیلات اکٹھی کیں اور پھر اس کے سربراہ پال جونز کو ساری تفصیل لکھ بھیجیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر پال کا جواب آ گیا کہ ان کا ادارہ بنیادی طور پر آگ میں جھلس جانے والوں یا کسی حادثے کے نتیجے میں اپنے اصلی خدو خال کھودینے والوں کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے۔ اور میرا کیس ان کے ادارے کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ میں نے پال کو دوسری میل بھیجی کہ کیا ان کا ادارہ محبت کرنے والوں کے خواب پورے نہیں کر سکتا؟ میں بھی تو تقدیر نہیں، صرف چہرہ بدلنے کے خواہش مندوں میں شامل ہوں۔ اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں

اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کروں تو میں اپنے چہرے کھلے کر ان کے ادارے کی شرط پر پورا اُترنے کو تیار ہوں۔ میں نے رات گئے یہ میل پال کو بھیجی اور وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک کر آنکھیں موند لیں، صبح سویرے پرندوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو پال کی میل میرے ان باکس میں نمایاں تھی۔ میں نے جلدی سے اسے کھولا اور تحریر پر نظریں دوڑائیں۔ وہ میل، پال نے ادارے کے آفیشل میل اکاؤنٹ سے نہیں کی تھی، بلکہ اپنے ذاتی پتے سے بھیجی تھی۔ یہ میل میں اپنے ذاتی پتے سے بھیج رہا ہوں۔ تمہاری میل نے مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مشرقی لوگوں کے جذباتی ہونے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا تھا، مگر تمہاری جذباتیت تو دنیا سے جدا ہے، ٹھیک ہے لڑکے، اگر تمہاری یہی ضد ہے، تو میں تمہارے بارے میں کچھ سوچوں گا، لیکن یہ سب کچھ میری ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ کیوں کہ میرا ادارہ بہر حال اپنے اصولوں کا پابند ہے۔ میں تمہیں چند ضروری ٹیٹ لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ پہلے تم اپنے مُلک کے کسی مستند طبی ادارے سے یہ ابتدائی ٹیٹ کروا کر مجھے بھیج دو۔ پھر جب تمہارے آنے کی ضرورت پڑی، تو میں تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ تب تک خدا کے لیے کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا۔ تمہارا مخلص، ڈاکٹر پال جوز۔“ میں نے میل پڑھ کر ایک لمبی اطمینان کی سانس بھری۔ گویا میری سمت طے ہو چکی تھی۔ اور سفر چاہے کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے اس کی سمت طے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ انسان زندگی میں بہت سے بوجھ ڈھوتا ہے، مگر ان میں سب سے بھاری بوجھ شاید خود ہماری اپنی سوچ، فکر کا ہوتا ہے۔ دفتر پہنچا تو لٹیٹی اور ڈائریکٹر پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ لٹیٹی نے شکوہ کیا کہ میں فلم کے مراحل میں پوری دل چسپی نہیں لے رہا ہوں، جب کہ وہ چاہتی ہے کہ ہر شعبے پر میری ذاتی نگرانی اور گرفت رہے۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ ہم بہت جلد گانوں کی فلم بندی کے لیے کینیڈا روانہ ہونے والے ہیں۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے، میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سب کو فلم کے گانوں کی فلم بندی کا بتا کر یونٹ کے ساتھ کینیڈا چلا جاؤں گا، جہاں تین چار مہینے علاج کے لیے رکنے کا کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈنا ہوگا۔ شاید چھ ماہ بھی لگ جائیں، مگر مجھے کسی طور یہ معرکہ سر کرنا ہی تھا۔

اس وقت، میں چاہتے ہوئے بھی سرجری کے بعد کے حالات پر کوئی سوچ بچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر اور زرد بین ہوتے ہیں۔ جن فیصلوں میں ہمارے دل کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ان کے اثرات سے نظریں پُجانے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کرتے، میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ایک بار اپنی مرضی کی سرجری کروالوں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں نے ایک دُور دراز کے بڑے اسپتال سے ڈاکٹر پال کے بتائے ہوئے طبی تجربے بھی کروا لیے تھے اور اب مجھے ان کی رپورٹس آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ مجسمہ بن جانے کے بعد یعنی کے گھر جانے کا کوئی خاص بہانہ نہ ہونے کے باوجود میں ہفتے میں ایک آدھ چکر اس کے گھر کا ضرور لگا لیتا تھا۔ کچھ گلیاں اور کوچے اپنی سمت بلانے کے بہانے خود تراش لیتے ہیں۔ جانے وہ مَن موئی سی لڑکی کس طرح چند دنوں ہی میں میرے دل کے ہر خانے پر اپنا قبضہ جما بیٹھی تھی۔ حالاں کہ میں نے تو اس دل کے کوڑا سدا کے لیے بند کر کے چابی کسی دریا میں پھینک دی تھی۔ یا پھر شاید مجھ جیسوں کے دل ہمیشہ کسی مخلص اور مہربان ساتھی کی دستک ہی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ شام کو دفتر سے اٹھتے وقت اچانک فون پر سنبل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”آپ جلدی سے شوکت خانم اسپتال پہنچیں۔ آپ کے دوست کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔“ میں سب جھوڑ چھاڑ کر کبیر کے ساتھ اسپتال کی طرف بھاگا۔ راہ داری میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے میرے قدموں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ ناساز کا رنگ سروسوں کی طرح پیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر خشک سوکھے پتے جیسے ہونٹوں سے بہ مشکل مُسکرایا۔ رستہ روک رہی ہے، تھوڑی جان ہے باقی..... جانے ٹوٹے دل میں کیا ارمان ہے باقی..... جانے بھی دے اے دل..... سب کو میرا سلام..... میں چلا، میں شاعر بدنام..... میں چلا، محفل سے ناکام..... میں چلا..... میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا ”کہیں نہیں جا رہے ہو تم، سُنا تم نے، میں اس شاعر کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔“ اس کے سر ہانے کھڑی سنبل اور استاد بھٹے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ بہ مشکل آنکھیں کھول کر بولا ”دیکھا ہی زاد پیارے، یہ تو واقعی اُسی فلم کا سین بن گیا یار۔ لگتا ہے، جیسے میری کہانی ڈائریکٹر نے تیس چالیس سال پہلے قلمی تھی، مگر یار، میں بہت تکلیف میں ہوں۔ یہ جان تو نکلتے نکلتے جان نکال دیتی ہے۔“ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا ”پُپ ہو جاؤ، خود کو ٹھہرا کر مت کرو۔“ ”نہیں پیارے، بولنے دو مجھے۔ بس آخری جھٹکن ہے، اس کے بعد تو آرام ہی آرام ہے۔“ ناساز نے سنبل کی طرف دیکھا ”یہ کہانی بھی اُدھوری رہ گئی ہی زاد۔ میرے جانے کے بعد ان باپ بٹی کا پورا خیال رکھنا۔ اور جب تمہاری فلم ریلیز ہو تو اس کے ٹائٹل میں میرا نام.....“ ناساز بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کا چہرہ تھپتھپایا ”ناساز..... پُپ کیوں ہو گئے، بولتے کیوں نہیں..... تم ہم سب کو اتنا بڑا دھوکا دے کر نہیں جاسکتے، بولو، بے وفا، دعا باز..... کچھ تو بولو..... بات کرو.....“ میری چیخیں سارے اسپتال میں گونج رہی تھیں۔ استاد بھٹے نے اسپتال کے عملے کی مدد سے مجھے ناساز کے بے جان جسم سے دُور کر دیا۔ میں چیختا چلا تارہ گیا۔ استاد بھٹے نے دبوچ کر مجھے گلے لگا لیا ”پُپ کر جاؤ..... ناساز اب کبھی نہیں بولے گا، وہ مر چکا ہے۔“

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، قلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بد ہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سنڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر گپک روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناساز کے جانے کے بعد میرا دل ہی اٹھ گیا، کسی کام میں مَن نہیں لگ رہا تھا میرا، بس سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ ناساز کا چہرہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹا ہی نہیں تھا۔ کچھ لوگ اپنی تقدیر میں صرف درد ہی لکھوا کر لاتے ہیں۔ سکھ کی سی یا شاید ان کی باری آنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایسی ہی ایک اُداس شام، جب میں اپنے اندر صبر سے کمرے میں بیٹھا قسمت کے اس ہیر پھیر سے متعلق ہی سوچ رہا تھا، تو عینی آگئی۔ ”کیوں سزا دے رہے ہیں خود کو، ہم میں سے کوئی بھی ناساز کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس کا جانا طے تھا، سو وہ چلا گیا۔ مگر ہم سب ابھی یہیں ہیں، ہماری خاطر ہی سہی، خود کو سنبھالیں۔“ میں نے اپنی نم آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ”اگر سب کا جانا طے ہی ہے، تو پھر ہم سب ایک ساتھ ہی کیوں نہیں چلے جاتے، یہ باریاں کیوں لگا دی گئی ہیں۔“ عینی میرے قریب بیٹھ گئی۔ ”باریاں اس لیے لگائی گئی ہیں کہ ہم جانے والوں کے بعد ان کے اپنوں کا دھیان رکھیں۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ وہ سنبھل اور استاد بننے خان کی ذمہ داری آپ پر ڈال گئے ہیں۔ کیا انہیں یونہی تنہا چھوڑ دیں گے پری زاد؟“ کیا ستم ہے کہ ہوا کے سب رستے، سب درزیں بند کر دینے کے بعد، زندگی ہمیں سانس لینے پر بھی مجبور کرتی ہے، کیوں کہ جینا تو ہے۔ ہاں، جینا تو پڑے گا، مزید ستم سہنے کے لیے، نئے گھاؤ جھیلنے کے لیے۔ اگلے ایک ہفتے میں شہر کی ایک نئی ہستی میں استاد بننے خان کے لیے ایک گھر کا انتظام کر دیا گیا، جہاں وہ اپنی موسیقی کی اکیڈمی اور کلاسز بھی شروع کر سکتے تھے۔ کمالی نے اس سارے معاملے میں بہت مہر ترقی دکھائی اور دو ہفتوں بعد ہی میوزک اکیڈمی کا اشتہار بھی شہر کے بڑے اخباروں کے پہلے صفحے پر لگ گیا، مجھے یقین تھا کہ اب ان باپ بیٹی کو اپنی گزر بسر کے لیے کسی کے آگے سوال دراز کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میری اس عرصے میں خود سے خود کی ملاقات بہت کم ہو پائی تھی، مگر جیسے ہی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا اور میں نے جانے کتنے دن بعد آئندہ دیکھا، تو مجھے ایک دم ہی ڈاکٹر پال کی یاد آگئی۔ میں نے اپنی ای میل کھولی تو ڈاکٹر پال کی تین میلز آچکی تھیں، جس میں اس نے میرے کرواتے گئے طبی تجزیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے اگلی صبح ہی رپورٹ لے کر اُسے ای میل کر دی۔ کمالی اس عرصے میں فلم پونٹ سے مسلسل رابطے میں تھا، اور مجھے وقفہ وقفہ پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ کینیڈا میں فلم بندی کے انتظامات بھی وہ مکمل کر چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کینیڈا روانگی سے قبل یعنی سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ اب اس زندگی کے تپتے صحرا میں تنہا چلتے چلتے میرے پاؤں اتنے آبلہ پا ہو چکے ہیں کہ خود میرے قدموں کے چھالے مجھے ڈھائی دیتے ہیں کہ انہیں اب کسی ہم سفر کے ساتھ کی چھاؤں درکار ہے۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا وہ میری عمر بھری ہم سفر بننا قبول کرے گی، کیا وہ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھتی ہے، کیا وہ میری تمام زندگی کی محرومیاں ختم کر کے مجھے اپنا سکتی ہے.....؟ میں نے راستے میں گاڑی رکوا کر پھول والے سے عینی کے لیے ایک گل دست بنوانے کا سوچا، لیکن پھر بہت دیر تک وہاں کھڑا پھولوں کا انتخاب کرتا رہا، دنیا کے سارے پھول پنکھڑیوں سے جو کر بنتے ہیں، مگر جب خود کسی پنکھڑی جیسی کو گلاب پیش کرنا ہو تو کوئی چناؤ کیسے کرے۔ ہر پھول اس کے سامنے بیچ لگتا تھا۔ ہر رنگ اس کے آگے پھیکا پڑ جاتا تھا۔ مجبوراً مجھے کچھ پھیکے رنگوں والے کم صورت گلابوں ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ مد مقابل جب ”گلاب تر“ ہو تو پھولوں کو بھی ہار ماننا ہی پڑتی ہے۔

میں بہت دیر اس کے گھر کے دروازے پر کھڑا رہ کر اپنی الجھتی سانسیں درست کرتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا، جیسے حُسن کی عدالت میں یہ میری پہلی پیشی ہے۔ دوسری گھنٹی کے جواب میں اندر سے قدموں کی آہٹ ابھری اور میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ گل دستے پر میری گرفت سخت ہو گئی اور پھر دروازہ کھلا تو میرا ہاتھ ہوائی میں بلند رہ گیا۔ اندر سے نکلنے والا نوجوان میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ ”جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ میں اُسے دیکھتا رہ گیا، لمبا قد، کھلتی رنگت، بکھرے بکھرے سے بال، گہری سیاہ آنکھوں میں عجیب سی کشش آمیز چمک، مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔ وہ خوبرو، با اعتماد اور مغرور سادہ لڑکا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میرا گل دستے والا ہاتھ میکینکی طور پر خود بخود پیچھے چلا گیا۔ میں نے گڑبڑا کر اس سے پوچھا ”تم کون ہو.....؟“ وہ لڑکا ہنس پڑا۔ ”لو، وہ بھی ہم سے پوچھتے ہیں.....؟ جناب ہم اپنا تعارف خود آپ ہیں۔ ڈاکٹر عدنان کہتے ہیں مجھے، یہ میری خالہ کا گھر ہے اور میں آج ہی یہاں نازل ہوا ہوں۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟“ میں نے اپنے ڈولتے دل کو سنبھالا۔ ”میں عینی کا دوست ہوں، پری زاد نام ہے میرا۔“ عدنان نے غور سے مجھے دوبارہ دیکھا اور پہلے لفظ کو کافی لمبا کرتا ہوا بولا ”اچھا..... تو آپ ہیں پری زاد..... گریٹ..... سر کھالیا ہے، اس پاگل لڑکی نے صبح سے آپ کا ذکر کر کر کے۔ سچ بتاؤں، تو میں آپ سے جیلس ہو رہا تھا۔“ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا وہ زور سے ہنس پڑا۔ بُرامت مایے گا، مذاق کی عادت ہے میری۔ اندر آئیں ناں۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ خالہ اور عینی اندر ہی ہیں۔“ میں پُپ چاپ اس کھنڈرے سے لڑکے کے پیچھے اندر داخل ہو گیا، پھر ہاتھوں میں پکڑا گل دستہ نہ جانے کب میرے ہاتھ سے کمرے کے گل دان میں منتقل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عینی بھی آگئی، وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ”ارے آپ آگئے پری زاد..... دیکھیں، کون آیا ہے۔ میرے بچپن کا ساتھی۔ میرا سب سے بہترین دوست، میرا کزن عدنان۔ سچ بتائیں، اس نالائق کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں لگتا ناں کہ یہ ڈاکٹر ہوگا۔ حرکتیں تو ابھی تک وہی گلی کے آوارہ لڑکوں جیسی ہیں اس کی۔“ عدنان نے زوردار قہقہہ لگایا ”تو گلی کا لڑکا ہی تو ہوں۔ تمہاری گلی کا ایک آوارہ، جو گھنٹوں دوپہر میں تمہارا کالج سے واپسی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یاد ہے ناں بلی.....“ وہ دونوں زور سے ہنس پڑے، جانے کیوں ٹھیک اُسی لمحے میں نے خود کو وہاں بے حد اجنبی محسوس کیا، کل تک یہی درود یوار مجھے کتنے مانوس، کتنے مہربان سے محسوس ہوتے تھے، اور آج ایک اجنبی کے آجانے سے میں خود بیگانہ سا ہو رہا تھا۔ عینی نے مجھے بتایا کہ عدنان نے طب کی تعلیم کے بعد آنکھوں کی فیلڈ میں اسپیشلائز کیا ہے اور اب اس کی پوسٹنگ اسی شہر میں ہو چکی ہے۔ عدنان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی پوری تن دہی سے عینی کی آنکھوں کے علاج کی کوئی صورت نکالنے میں جتا ہوا ہے۔ عدنان اور عینی ایک دوسرے سے بہت بے تکلف محسوس ہوتے تھے اور دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے رہے تھے۔ جب تک عینی کی ماں رات کے کھانے کے انتظام کے لیے باورچی خانے میں مصروف رہیں، دونوں بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنستے رہے۔ عینی نے عدنان کو ٹوکا ”بس بس..... رہنے دو یہ تابع داری کی باتیں، خوب جانتی ہوں میں کہ جناب کڑی دوپہروں میں کس کے لیے دھوپ چانا کرتے تھے۔ کیا نام تھا اس عینکی کا۔ ہاں، نگہت اور وہ دوسری بھینٹی، مہوش اور وہ تیسری.....“ عدنان نے جلدی سے اسے روکا۔ ”اوہو، بس بھی کرو، وہ بچپنا تھا میرا..... اور ایسی دو چار معاشقے نما دوستیاں تو سبھی کرتے ہیں لڑکپن میں۔ کیوں پری زاد صاحب، ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں، آپ نے بھی کی ہوں گی۔ کچھ خواب تو پالے ہوں گے، اس عمر میں آپ نے بھی.....“ میں نے غور سے عدنان کی طرف دیکھا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب! خواب پالنے کے لیے نیند کے کچھ خوب صورت

”پالنے“ بھی ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو آج تک نیند کا وہ ”پالنا“ ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ نیند آجائے تو شاید کبھی خواب بھی پال سکوں۔“ عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا ”واہ، میری پیاری کزن یونہی آپ کی اتنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی، بڑی گہری بات کہہ دی آپ نے۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا ”اب میں اجازت چاہوں گا۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ دونوں بوکھلا سے گئے۔ یعنی جلدی سے بولی ”ارے، آپ کہاں چل دیئے، امی نے کھانا لگا دیا ہے اور آپ نے تو آنے سے پہلے فون پر کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے، بتائیں ناں.....؟“ عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے بات بنائی ”ارے ہاں، یاد آیا۔ فلم کا یونٹ کینیڈا جا رہا ہے۔ شاید میں بھی جاؤں، سوچا تم سے بھی پوچھ لوں۔“ یعنی خوشی سے چلائی ”واہ زبردست! کاش میں بھی ساتھ چل سکتی، مگر اب یہ صاحب جو تشریف لے آئے ہیں، میرے دشمن جاں..... یہ مجھے کہاں جانے دے گا اب۔“ میں نے چونک کر یعنی کی طرف دیکھا ”کیوں؟“ عدنان نے جلدی سے دخل دیا۔ ”ہُدی زاد صاحب! آپ ہی سمجھائیں اس لڑکی کو۔ میں نے امریکا کے ایک بڑے طبی ادارے سے یعنی کی آنکھوں کے میچنگ لینز کی بات کی ہے، وہ لوگ نوے فی صد ہمد امید ہیں کہ وہ یہ آپریشن کر سکتے ہیں اور انہیں مشابہت والا قرنیہ بھی مل جائے گا، کیوں کہ آج کل باہر کے ملکوں میں عموماً سزائے موت کے قیدی یا بستر مرگ پر پڑے مریض اپنے اعضاء مرتے وقت دان کر جاتے ہیں یا اپنے بیوی بچوں کی آئندہ کفالت کے لیے بھاری رقم کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ میں نے یعنی کے میچنگ لینز کے لیے ایسے کئی اداروں میں رجسٹریشن کروا رکھی ہے اور وہ لوگ قرنیہ ملتے ہی ہمیں اطلاع کر دیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے وقت میں یعنی کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہمیں دیر ہو جائے۔“ یعنی نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”خواب دیکھنا چھوڑ دو مائی ڈیئر کزن ڈاکٹر عدنان! پہلے تو یہاں سے امریکا جانے کے لیے ہی لاکھوں روپے چاہیے ہوں گے، اور پھر ڈونیشن اور آپریشن کا خرچ الگ۔ کہاں سے آئیں گے اتنے روپے.....؟ اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف اپنی جمع کی ہوئی رقم ہی سے اپنا آپریشن کرواؤں گی۔ اور ہم دونوں یہ بات بہت پہلے طے کر چکے ہیں۔ سونو مور بحث اوکے.....“ وہ دونوں بچوں کی طرح بحث کرتے رہے۔ میں نے یعنی سے اجازت چاہی اور بھاری قدموں سے وہاں سے اٹھ آیا۔

سارے راستے ان دونوں کی نوک جھونک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ عدنان کو یعنی سے بے تکلف ہوتے دیکھ کر ایک عجیب سی بے چینی میرے رگوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر خود یعنی بھی تو اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلفی سے پیش آرہی تھی۔ جنہیں ہم چاہتے ہیں، وہ کسی اور سے بے تکلف ہو کر بات کریں تو ہمارے خون کی گردش کیوں تھمنے لگتی ہے۔ کانوں جیسی پنکھن اور کک ہمارے وجود کو کیوں چھلنی کرنے لگتی ہے؟ کیا اسی کورقابت کہتے ہیں۔ ساری رات میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ رقابت تو محبت سے بھی زیادہ جان لیوا آزار ہے۔ اگلے روز ٹیلی فون کی ہر گھنٹی پر میں چونک چونک جاتا۔ مگر یعنی تو جیسے عدنان کے آنے کے بعد بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ مجھے چڑچڑاہٹ سی ہونے لگی اور میرا عملہ اس کا نشانہ بننے لگا۔ کمالی نے یہ بات نوٹ کر لی اور تیسرے دن ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ مجھے کوئی پریشانی ہے۔ میں اُسے کیا بتاتا، مجھے تو خود پتا نہیں تھا کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ مگر چوتھے روز جب میرے پی اے نے جب مجھے اطلاع دی کہ ”مس قراۃ العین آپ سے ملنے آئی ہیں“ تو ایک لمحے میں ساری بے چینیاں، ساری بے تابیاں جانے کہاں ہوا ہو گئیں اور میں تیزی سے ملاقاتی کمرے کی طرف لپکا، مگر وہ تنہا نہیں آئی تھی۔ عدنان بھی اس کے ساتھ تھا۔ میری آہٹ سننے ہی وہ ناراضی سے بولی ”کہاں غائب ہیں آپ، تین دن سے، نہ کوئی فون نہ کوئی خبر خبر۔ میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ جان لیں اچھی طرح۔“ میں نے مصروفیت کا بہانہ کیا، مگر وہ روٹھی رہی، عدنان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”بڑی ضدی ہے یہ بچپن سے سر۔ مجھ سے پوچھیے؟“ میں نے گہری نظروں سے اس حُسن ناراض کو دیکھا، سفید لباس اور سیاہ دوپٹے میں وہ نور کا ایک ہالہ لگ رہی تھی۔ ”چلو کچھ جرمانہ طے کر دو، میری غیر حاضری کا۔“ آخر کار، بات یوں بنی کہ مجھے اُن دونوں کو رات کے کھانے پر شہر کے ایک مشہور اوپن ائزرےستوران میں مدعو کرنا پڑا۔ عدنان نے جاتے وقت یعنی کے کمرے سے نکلتے ہی جلدی سے مجھے بتایا کہ یعنی کے لیے میچنگ لینز کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر یعنی جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عدنان نے دبے لفظوں میں مجھ سے رات کو یعنی کو منانے کی درخواست کی۔ وہ اپنا آبائی گھر بیچ کر یعنی کا علاج کروانا چاہتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد پھر سے وہی ہزار خدشے، ہزار وسوسے، مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میری محبت ریت کے ذروں کی طرح میری مٹھی سے نکلتی جا رہی ہے۔ رات کو رےستوران کی ٹیبل پر وہ دونوں مجھ سے پہلے موجود تھے۔ کتنے مکمل لگتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ، جیسے دو ہنسوں کا جوڑا ہو۔ کوئی ہم تینوں کو وہاں ایک ساتھ بیٹھے دیکھتا، تو اسے میرا وجود ہی اضافی لگتا۔ عدنان کی کوئی فون کال آئی تو وہ اٹھ کر ذرافا صلے پر چلا گیا۔ یعنی نے میری خاموشی محسوس کر لی۔ ”آپ اتنے چپ چاپ سے کیوں ہیں ہُدی زاد..... آج دن کو بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ گم حُسن سے ہیں۔“ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، تم عدنان کی بات مان کیوں نہیں لیتیں۔ وہ تمہارے ہی بھلے کی بات کر رہا ہے۔“ یعنی نے لمبی آہ بھری ”اچھا..... تو ڈاکٹر صاحب کا جادو آپ پر بھی چل گیا۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”ہاں، وہ ہے ہی ایسا جادوگر۔ آج کل چاروں طرف مجھے اسی کا سحر محسوس ہوتا ہے۔“ یعنی ہنس دی۔ ”ہاں، ٹھیک کہا آپ نے، پتا ہے ہُدی زاد، میں نے سات سال کی عمر کے بعد عدنان کو نہیں دیکھا، جانے اب کیسا دیکھتا ہوگا۔ پہلے تو ہر وقت مٹی میں اُناٹا ہوتا تھا۔ بڑی مار پڑتی تھی اُسے خالہ سے۔ آپ کو ایک بات بتاؤں ہُدی زاد۔ میری زندگی کی بہت بڑی خواہش تھی کہ جب بھی میری بینائی واپس آئے،

میں سب سے پہلے عدنان ہی کو دیکھوں۔ ہاں، مگر اب اس فہرست میں ایک اور ہستی بھی شامل ہو چکی ہے، اور وہ آپ ہیں ہُدی زاد..... اب میں عدنان کے ساتھ آپ کو بھی پہلی نظر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میرا دل چاہا کہ اس سے کہوں کہ کہاں ہیرے اور کونکے کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہی ہو۔ دیکھے جانے کے قابل صرف عدنان ہے۔ اتنے میں عدنان بھی واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ ”جی ہُدی زاد صاحب! کچھ آیا اس بگلی کی عقل میں یا نہیں۔ اسے سمجھائیں کہ اپنوں کے خلوص کو یوں ٹھکرایا نہیں کرتے۔“ یعنی نے احتجاج کیا۔ ”ایسی بات نہیں ہے، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ تمہارے پاس تمہارے آبائی گھر کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اور پھر ہم دونوں کے بچپن کی اور خالہ کی کتنی یادیں وابستہ ہیں اُس گھر سے، میری نظر میں وہ سب یادیں میری بینائی سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ بس، ہو گیا فیصلہ۔ تم وہ گھر کبھی نہیں بیچو گے۔ اور اگر کبھی تم نے ایسا کیا تو ساری زندگی مجھ سے بات مت کرنا۔“ عدنان نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا، میں نے دخل اندازی کی ”تم دونوں خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہو۔ یعنی پر میری دوستی کے بھی کچھ قرض باقی ہیں اور میں اسی دوستی اور رشتے کے حق سے آج یہاں یہی کہنے آیا ہوں کہ یعنی کے علاج کا تمام خرچہ میں برداشت کروں گا، کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے۔“ ”نہیں ہُدی زاد! ایسا مت کہیں، میں آپ سے رقم نہیں لوں گی۔ میں نے زندگی بھر ایک یہی خودداری کا بھرم ہی تو کیا ہے۔ کیا آپ دونوں مجھ سے میری عمر بھر کی یہ واحد کمائی بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ کیا فائدہ ایسی بینائی کا کہ جس کے ملنے کے بعد بھی میری نظر تمام غم جھگی رہے۔ پلیز، آپ ایسا نہ کریں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے، اگر تمہاری یہی مرضی ہے، تو یوں ہی سہی، مگر پھر تمہیں میری بھی ایک بات ماننا ہوگی۔ میں عمر بھر تمہاری خودداری کا یہ بھرم قائم دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن تمہارا علاج بھی اسی قدر ضروری ہے، لہذا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال عدنان کا آبائی گھر میں خرید لوں گا۔ مکان کی رقم سے عدنان تمہارا علاج مکمل کروائے گا، لیکن تم دونوں کے بچپن کی یادوں کا مسکن وہ گھر، میرے پاس عدنان کی امانت کے طور پر رہے گا۔ عدنان جب بھی رقم جمع کر لے گا، مجھ سے اپنا مکان واپس لے سکتا ہے۔“ یعنی نے بے چینی سے پہلو بدلا ”لیکن.....“ ”کوئی اگر، مگر، لیکن نہیں سنوں گا میں، بس طے ہو گیا۔ تم لوگ جانے کی تیاری کرو، آج کل ویسے بھی اچھے ڈاکٹروں کا کال پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے عدنان کچھ ہی برس میں اپنا مکان واپس حاصل کر لے گا۔“ عدنان نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا ”یہ ہوئی ناں بات۔ مجھے یقین تھا اس مسئلے کا آپ ہی کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔ آپ واقعی کمال ہیں ہُدی زاد صاحب.....“

اس وقت تو یعنی خاموش رہی، لیکن رات گئے اس کا نمبر میرے موبائل فون پر جگمگانے لگا ”ہری زاد! میں آپ کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں، میں جانتی ہوں آپ میری خاطر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔“ میں نے بات مذاق میں نالی۔ ”نہیں بے وقوف لڑکی! تمہیں نہیں پتا کہ پراپرٹی کی قیمتیں آج کل آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ عدنان کا گھر لے کر میں نے کوئی گھانٹے کا سودا نہیں کیا۔ دیکھ لینا، عدنان رقم پکا نہ سکا، تو دس گنا زیادہ قیمت پر بیچ دوں گا۔ تم نے ہری زاد کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟“ وہ ہنس پڑی۔ ”آپ ہمیشہ گھانٹے کا سودے ہی کرتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، لیکن آپ کو میری شرط یاد ہے ناں۔ جب کبھی میں دنیا دو بارہ دیکھوں، تو میری پہلی نظر کے فریم میں آپ کو ضرور موجود رہنا ہوگا۔ بولیں، قبول ہے تو ٹھیک، ورنہ ابھی منع کرتی ہوں عدنان کو کہ گھر کے کاغذات نہ بنوائے آپ کے لیے۔“ میں نے جلدی سے حامی بھری۔ ”ٹھیک ہے ضدی لڑکی، مگر دیکھو، اب مزید کوئی بہانہ مت کرنا۔ جیسا تم چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا۔“ میں نے یعنی کو تو تسلی دے دی، مگر خود میرا چین و سکون ہمیشہ کے لیے ہوا ہو گیا۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر لان میں ٹہلتا رہا کہ آنکھیں مل جانے کے بعد یعنی جب مجھے دیکھے گی، تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ صبح سویرے عدنان اپنے گھر کے کاغذات بنوا کر لے آیا۔ میں نے رقم کا چیک عدنان کے حوالے کیا، تو خوشی سے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ عدنان اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ”سنو عدنان.....“ وہ پلٹا تو میں نے اس کے گھر کے کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ”یہ گھر تمہارا تھا، اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ میں نے صرف یعنی کو منانے کے لیے یہ گھر خریدنے کا ڈراما کیا تھا۔ یعنی کی آنکھیں واپس آ جائیں، اس سے زیادہ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، البتہ یہ مکان والا راز یعنی کے لیے ہمیشہ راز ہی رہے گا۔“ عدنان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ہری زاد صاحب! میں دن رات محنت کر کے آپ کی ایک ایک پائی واپس کر دوں گا۔ یقین جانیے، یہ رقم مجھ پر ہمیشہ قرض رہے گی۔“ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہمارا بھی اس لڑکی پر کچھ حق ہے ڈاکٹر صاحب، کچھ قرض ہم پر بھی واجب ہیں ابھی۔“ عدنان جاتے جاتے ایک بار پھر پلٹا۔ ”آپ کو میں ہر لمحے کی خبر دیتا رہوں گا۔ ہم اگلے ہفتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، مگر یعنی کی آنکھوں کی نئی کھٹلنے سے پہلے آپ کو بھی امریکا پہنچنا ہوگا، ورنہ وہ ضدی لڑکی آپریشن ہی نہیں کروائے گی۔ بہت مان دیتی ہے وہ آپ کو۔ اس نے آپریشن کے لیے ”ہاں“ بھی صرف آپ کے کہنے ہی پر کی ہے۔“ میں نے عدنان کی آنکھوں میں تارے سے جگمگاتے دیکھے۔ اور یہ ستارے مجھے ہر بار اس کی آنکھوں میں تب دکھائی دیئے تھے، جب وہ یعنی کا ذکر کرتا تھا۔ ”آپ جانتے ہیں ہری زاد صاحب۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جس دن یعنی پہلی بار یہ رنگین دنیا دیکھے گی، میں اُسی دن اُسے شادی کے لیے پروپوز کر دوں گا۔ میں جانے کب سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔“ میرے سر پر جیسے ساری عمارت دھڑام سے گر گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ ”کیا..... میرا مطلب ہے کیا یعنی کو بھی اس بات کی خبر ہے؟“ عدنان نے جیسے خوابوں کی ہستی سے جواب دیا۔ ”ہاں، وہ بھی جانتی ہے کہ میں ہمیشہ سے اُسے اپنا ہم سفر بنانا چاہتا ہوں، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس دن یہ پروپوزل اس کے سامنے رکھوں گا۔ میری مرحومہ ماں اور میری خالہ کی بھی ہمیشہ ہی سے یہی خواہش تھی۔ بس اب وہ دن بھی قریب ہے۔ چلتا ہوں، بہت سے کام اُدھو رہے پڑے ہیں۔“ عدنان پلٹ کر چلا گیا۔

میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا، میں وہیں کرسی ہی پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر میں کمالی کسی کام سے اندر آیا تو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں سر.....؟“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کمالی! میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔“ میں دروازے تک پہنچ کر رُک گیا۔ کمالی ابھی تک گم صم سا کھڑا تھا۔ ”کمالی! تم نے کہا تھا کہ کبھی تم نے بہت ٹوٹ کر کسی سے محبت کی تھی، تو کیا اس محبت کا کوئی رقیب بھی تھا؟“ کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”نہیں سر! خوش قسمتی سے رقابت کا زہر میں نے کبھی نہیں پیا۔ مگر سنا ہے کہ محبت کی اصل روح تبھی ظاہر ہوتی ہے، جب کوئی رقیب درمیان میں پڑتا ہے۔“ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کمالی سے پوچھا۔ ”رقیب کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے کمالی؟“ ”رقیب کے ساتھ رقابت کرنی چاہیے سر۔ رقیب پر رحم کھانے والا دراصل اپنی محبت کے ساتھ مخلص نہیں ہوتا۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”لیکن محبت تو محبت ہوتی ہے، کوئی جنگ نہیں۔“ کمالی مسکرا دیا۔ ”محبت میں رقابت سے بڑی جنگ بھلا اور کیا ہوگی، اس دنیا میں سر..... اور آپ نے سنا تو ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔“ میں دفتر سے باہر نکلا تو رقابت کا زہر میرے پورے وجود میں اپنے نیچے گاڑنا شروع کر چکا تھا۔ جانے کب دن ڈھلا اور کب رات ہوئی۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا۔ کبیر نے رات گئے جب گھر کے دروازوں اور گیٹ کو تالا لگانے کی اجازت چاہی تو میری آنکھیں اس پر جم گئیں۔ ”کبیر خان تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو.....؟“ کبیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”ہم جان لے سکتا ہے اور جان دے بھی سکتا ہے صاحب.....“

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ”خدا اور محبت“ اور ”بچپن کا دسمبر“ نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، توجہ، سڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ”عبداللہ“ کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ”عبداللہ“ نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

”پری زاد“ ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اُن گنت بد صورت رویوں، بدجیت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا ہٹا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ”سڈے میگزین“ روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندر نگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبیر خان کچھ دیر تک میرے جواب کا انتظار کرتا رہا ”آپ حکم کرو صاب..... کبیر خان کا جان بھی حاضر ہے، آپ کے لیے۔“ میں اپنے خیالات سے چونکا ”ہاں..... فی الحال کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کچھ خیال آ گیا تھا، تم جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہاری گھر والی راہ دیکھتی ہو گی تمہاری۔“ کبیر کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور الجھن زدہ سادھاں سے چلا گیا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اندر یہ کیسی عجیب سی ایک جنگ چھڑنے لگی تھی۔ جیسے میرا وجود دو حصوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہو۔ میرے اندر ایک نیا ”پری زاد“ جنم لینے لگا تھا، جو مجھے رقیب سے رقابت کے سبق سکھا رہا تھا۔ وہ سارا دن میرے اندر بوتل رہتا۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو! حق انسان، خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کا انتظام خوب کیا ہے تم نے، اب تمہاری رقم سے عدنان یعنی کی آنکھوں کا علاج کروائے گا اور پھر جب وہ لڑکی تمہیں اس شہزادے کے پہلو میں کھڑا دیکھے گی، توفیصلہ کس کے حق میں ہو گا، یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا عدنان نے، وہ بہت مان دیتی ہے مجھے، مگر صرف مان، عزت اور تعظیم۔ اور میں نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ جس تہتم کو میں اپنے مقدر کی پھوار سمجھا تھا، وہ تو اس کی عادت نکلا۔ چار دن اس نے مجھ سے ہنس کرات کیا کر لی اور ذرا سا اپنا وقت مجھ پر صرف کیا کر دیا، میں تو اس کی محبت کا حق دار سمجھ بیٹھا تھا خود کو، احمقوں کی جنت کا سردار تھا میں۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا، اپنے اس سدا کے غدار دل کے ہاتھوں میں نے۔ میں وہ منافق تھا، جسے سو بار ایک ہی سوراخ سے ڈسا گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چیر کر اس بے وفا قلب کو باہر نکالوں اور اپنے قدموں تلے اُس وقت تک روند تار ہوں، جب تک کہ زندگی کی آخری رُمق بھی ختم نہ ہو جائے۔

اگلے دن میں گھر سے نکلا تو جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور پھر ایک ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر ڈرائیور کو گاڑی اُس طرف موڑنے کو کہہ دیا۔ میں کچھ دیر تنہا بیٹھنا چاہتا تھا اور کبھی کبھی تنہائی ہمیں صرف لوگوں کے ہجوم ہی میں ملتی ہے۔ ویرانوں میں تو ہم اپنے سامنے مزید نمایاں ہو جاتے ہیں اور مجھے ایسی تنہائی چاہیے تھی، جہاں خود مجھے بھی میرا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لابی میں بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے گزر گئے۔ یہ پانچ اور سات ستارہ ہوٹل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک دنیا ایک خلقت وہاں آتی جاتی رہتی ہے، مگر کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے، مگر عموماً مسکرانے کی وجہ نامعلوم رہتی ہے، اچانک لابی میں ایک شور سا اٹھا اور کچھ لوگ ایک جانب لپکے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لبتی اپنے اسٹاف کے ساتھ لابی میں داخل ہو رہی تھی۔ میڈم شپارہ کے مداح اس سے آٹو گراف لینے میں مصروف تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لبتی کی ساکھ بطور ہیروئن پھر سے بحال ہو چکی تھی۔ جانے یہ آٹو گراف لینے والے مداح بعد میں اس آٹو گراف کو سینٹ سنبھال کر بھی رکھتے ہوں گے یا پھر وقت گزرنے کے بعد یہ یادیں بھی روڑی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لبتی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ سب سے معذرت کر کے میری طرف چلی آئی ”ارے پری زاد، تم.....؟ کیا کوئی میٹنگ وغیرہ ہے؟“ ”نہیں، خود سے چھپنے کے لیے یہاں آ بیٹھا تھا۔“ میرا جواب سن کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ ”کیوں جلاتے رہتے ہو خود کو ہمیشہ؟ کب تک جلتے رہو گے۔ یہ دنیا تمہارے اندر کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ پلیز، خود کو اس دنیا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو۔“ میں دھیرے سے مسکرایا ”گویا منافقت کا درس دے رہی ہو۔“ ”نہیں، پری زاد نہیں۔ مگر یہ دو غلاپن ہماری فطرت بن چکا ہے۔ کمائی صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ تم ہمارے ساتھ کینیڈا نہیں جا رہے، کیا کوئی پریشانی ہے.....؟“ میں نے بات ٹالی ”نہیں، تم لوگ پہنچو، میں بعد میں آ جاؤں گا اور سنو، مجھے یقین ہے کہ یہ فلم تمہارے کیریئر کی بہترین فلم ہو گی۔ لیکن وعدہ کرو، سُہر ہٹ ہو جانے کے بعد پہلا آٹو گراف میرے لیے ہو گا۔“ وہ ہنستے ہنستے رو پڑی۔ ”مت کیا کرو ایسی باتیں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ اور اگر میرا بس چلے تو ساری دنیا کو تم سے آٹو گراف لینے بھیج دوں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں تمہاری کتنی احسان مند ہوں پری زاد.....“ میں نے شکوہ کیا۔ ”پھر وہی احسان کی بات؟ کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ دوستی میں احسان نہیں ہوتا۔“ لبتی کی آنکھیں ابھی تک نم تھیں۔ ”تم نہیں جانتے پری زاد! مجھ جیسے لوگ جو زندگی میں اُن گنت سمجھوتے کر کے یہاں تک پہنچتے ہیں۔ ان کے لیے کسی کا یہ بے لوث رویہ دنیا کے کسی بھی احسان سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہمارے ضمیر کو غر بھر کچوکے لگتا رہتا ہے کہ بدلے میں ہم اپنے محسن کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائے اور یہ احساس بڑا بے سکون کر دینے والا ہوتا ہے۔“ لبتی کے جانے کے بعد بھی میں بہت دیر تک بے مقصد وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اپنا موبائل فون خاموش کر دیا تھا۔ بے خیالی میں نظر پڑی تو کمائی اور یعنی سمیت بہت سے لوگوں کی کالز دکھائی دیں۔ عجیب عذاب نما شے ہے یہ سیل فون بھی، ہر وقت ہر کسی کی دسترس میں رکھتا ہے، کسی مضبوط ٹکٹے جیسا۔

دفتر پہنچا تو پی اے نے بتایا کہ عینی بی بی کا درجنوں بار فون آچکا ہے۔ اس نے بنا پوچھے فون ملا دیا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ ”کہاں چلے جاتے ہیں آپ یوں بنا بتائے۔ چار پانچ دن بعد میری روائگی ہے اور آپ ہیں کہ مجھے وقت ہی نہیں دے رہے۔ یاد رکھیں پری زاد، اگر آپ وقت پر نیویارک نہ پہنچے تو میں آپریشن نہیں کرواؤں گی اور اسے دھمکی مت سمجھیے گا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ کچھ تلخ سا ہو گیا۔ ”نہ ہوا کرو میرے لیے اتنا پریشان۔ مجھ جیسے بے مول انسان کی اتنی فکر نہ کیا کرو۔ اور بہت لوگ ہیں یہاں تمہاری توجہ کے قابل۔“ عینی رو ہانسی ہو گئی۔ ”کیوں، کیا مجھے آپ کے لیے فکر کرنے اور پریشان ہونے کا حق بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جا رہی۔“ اس نے فون رکھ دیا اور پھر شام تک وہ بڑی مشکل سے مانی۔ جب انسان خود ہی سے روٹھا ہوا ہو تو اسے کسی دوسرے کو منانا کتنا

مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اُس روز ہوا۔ تیسرے دن فلم یونٹ کینیڈا روانہ ہو گیا۔ میری بے چینی بھی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ میرے اندر پلٹا نیا پری زاد مجھے دن بھر کچھ کے لگا تار ہوتا تھا۔ رقیب سے رقابت اور دشمن سے دشمنی کی جاتی ہے اور تمہاری محبت کو تم سے چھین کر لے جانے والا تمہارا دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے پری زاد، یعنی کی آنکھوں کا آپریشن کروانے میں اتنی جلدی نہ کرو۔ پہلے اس عدنان نامی کانٹے کو نکل جانے دو۔ کاش عینی کو کبھی بینائی ہی نہ مل پائے۔ پری زاد کے لیے تو اس کی کوئل روح کی چاندنی ہی کافی ہے، غم بھرا جالا کرنے کے لیے۔ اس کی بینائی کی ضرورت تو اس رقیب کو ہے اور رقیب کی خواہش پوری کرنے والا احق بھلا اس دنیا میں کون ہو گا۔ میں نے اس سحرار کی گونج سے، درد سے پھٹنے سر کو تھام لیا۔ اسی وقت کبیر خان کسی کام سے دفتر میں داخل ہوا تو میرا زرد چہرہ اور پسینے سے شرابور وجود دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا صاب..... سب خیر تو ہے؟“ اور شاید ٹھیک وہی لمحہ تھا، جب میں اپنی برداشت کی حدیں پار کر گیا۔ ”کبیر خان..... ادھر تمہارے علاقے میں اگر کوئی تم سے تمہاری محبت چھین کر لے جائے تو تم کیا کرتے ہو.....؟“ ”ہم اس کو قتل کر دیتا ہے صاب..... ہمارا علاقے میں محبت اور غیرت کا نام پر مار دینا عام بات ہے۔“ میں نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ ”کوئی میری محبت چھین کر لے جا رہا ہے کبیر خان۔ اس کو بھی ختم کر دو“ کبیر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ ”تم صرف اس کا نام بولو صاب..... چو نہیں گھنٹے میں وہ اس دنیا سے چلا جائے گا۔“ میں نے ایک کاغذ کے رقعے پر عدنان کا نام اور پتا لکھ کر کبیر کے حوالے کر دیا۔ ”یہ لڑکا آج کل زیادہ تر یعنی بی بی کے گھر ہی پر رہتا ہے۔ دھیان رہے۔ یہ کام تب ہونا چاہیے، جب وہ لڑکا تنہا ہو۔“ کبیر نے سر جھکا دیا۔ ”آپ فکر مت کرو صاب۔ ہم سمجھ گیا۔“ کبیر کسی اچھے وفادار کی طرح زیادہ سوال جواب کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

میرے سینے پر رکھا ایک بھاری پتھر ہٹا تو ضمیر کے بوجھ کی دوسری بڑی اور اس سے بھی بھاری سل پورے وجود کو کچلنے لگی۔ یہ ہم جیسوں کا ضمیر اتنا زندہ کیوں رہتا ہے؟ یہاں تو لوگ پل بھر میں سیکڑوں گھرا جاز دیتے ہیں اور پلٹ کر ذرا دیر رک کر دیکھتے بھی نہیں۔ میں تو پھر بھی صرف اپنے دل کا آنگن آباد کرنا چاہتا تھا۔ کب چاہتا تھا، میں نے کہ ایسا ہو، مگر ایسا ہو رہا تھا، تو اس میں میرا قصور کیا تھا؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ضمیر ہمیں گناہ کرنے سے روکتا نہیں۔ صرف گناہ کا مزہ کر کر کر دیتا ہے۔ میں تو وہ بے ہنر تھا کہ نہ نیکی کو نیکی کی طرح ادا کر سکا اور نہ گناہ کو گناہ کی طرح نبھایا، کیوں کہ چاہے گناہ ہو یا پھر ثواب، دونوں کے لیے بہر حال طرف کی ضرورت پڑتی ہے۔ شام کو دفتر سے نکلنے سے پہلے مجھے عینی کا پیغام ملا کہ وہ بیرون ملک روانہ ہو گئی سے قبل اپنے مجسموں کی ایک نمائش رکھ چکی ہے، جس کا آج ہی افتتاح ہے۔ لہذا میں دفتر سے سیدھا شہر کی بڑی آرٹ گیلری پہنچ جاؤں۔ مجھے لگا، جیسے عدنان کو راستے سے ہٹانے میں قدرت خود میری مدد کرنا چاہتی ہے۔ یعنی بہت دیر تک اپنی مصروفیت میں الجھی رہے گی اور کبیر خان کو وار کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ میرے سارے جسم میں چوینیاں سی ریگنٹے لگیں۔ جرم کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے اور جب کوئی نادان جرم کرنے کی ٹھان لے تو پھر یہ نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور شاید دنیا کے ہر گناہ کے پیچھے یہی فلسفہ کار فرما رہتا ہے۔

آرٹ گیلری لوگوں سے کچھ کچھ بھری ہوئی تھی۔ کمالی بھی دفتر میں عینی کی دعوت پر میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ تقریب کا مہمان خصوصی بھی مجھے ہی مقرر کیا گیا ہے۔ میں نہ نہ کرتا رہ گیا، مگر جھٹ فیتہ کانٹے والی قینچی میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ فیتہ کٹنا تو تالیوں کی گونج میں ہم اس ہال میں داخل ہو گئے، جہاں عینی کے بنائے ہوئے بہت سے فن پارے رکھے گئے تھے۔ میں نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، مگر مجھے عدنان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میرے دل کے چور نے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ میں عینی سے اس کے بارے میں پوچھ سکوں۔ اس لڑکی کی انگلیوں کا ہنر سارے ہال میں بکھرا ہوا تھا اور اس کے فن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ لوگوں نے جی بھر کر اُسے داد دی۔ مغرب کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوا، تو میں نے کبیر خان کو ہال سے باہر جاتے دیکھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑا تھا کہ ایک بنی ٹھنی سی لڑکی ایک پختہ عمر عورت کے ساتھ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ”کیسے ہیں پری زاد صاحب، کبھی غریبوں کو بھی یاد کر لیا کریں۔ آپ نے توشہ پارہ کے بعد کسی اور فلمی ہیروئن کو دیکھا تک نہیں۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کمالی نے جلدی سے تعارف کروایا۔ ”سریہ میڈم زارا ہیں۔ شہ پارہ کی ٹکڑ کی ہیروئن ہیں۔“ زارا نے انکساری سے سر جھکایا ”کہاں جی..... شہ پارہ کی ٹکڑ کی ہوتی تو آج میں بھی پری زاد صاحب کی کسی فلم میں کاسٹ ہوتی، مگر انہوں نے تو ہمیں پوچھا تک نہیں۔“ کوئی اور موقع ہوتا تو میں شاید اس کی بات اطمینان سے سنتا، مگر اس وقت میرا سارا دھیان کبیر اور عدنان کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے جان ٹھکانے کے لیے کہا ”اگر میں نے کوئی دوسری فلم بنائی، تو آپ کو ضرور موقع دوں گا۔ فی الحال میں کسی اور الجھن میں ہوں۔ معاف کیجیے گا۔“ کمالی نے میرے ہٹنے کے بعد جانے بات سنبھالنے کے لیے اس حُسن بے پروا کو کیا کہا۔ میں ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہو کر بظاہر ایک فن پارہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کمالی ہاتھ میں ایک تعارفی کارڈ لیے میری طرف آ گیا۔ ”سرا یہ زارا نے اپنا کارڈ دیا ہے اور اس کے پیچھے اپنا ”خاص“ نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کبھی آپ ان کے ساتھ بھی ڈنر وغیرہ کریں۔“ میں نے کارڈ دیکھ کر بے پروائی سے کمالی کے حوالے کر دیا۔ وہ کچھ حیران ہوا۔ ”تم جانتے ہو کمالی! مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ حُسن جب خود اپنی قیمت لگانے پر غل جائے تو بہ یک وقت اس سے زیادہ گراں اور ارزاں جنس زمانے میں کوئی دوسری نہیں ہوتی۔“ کمالی مُسکرایا ”یہ آپ ہی ہیں، جو اس جنس کو ارزاں سمجھ رہے ہیں سر، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی شہر بھر کے امراء اسی زارا کے ساتھ لُنج یا ڈنر پر ذرا سا وقت گزارنے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا سر کہ جب حُسن اپنی قیمت لگانے پر آجائے تو اس سے ہنگامی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی۔“ میں نے سر جھٹکا ”وہ حُسن ہی کیا جو پک جائے۔“ ”ٹھیک کہتے ہیں سر آپ، مگر بات اگر سودے بازی کی ہو تو حُسن کے پاس دان کرنے کے لیے سب سے بڑا عطیہ حُسن ہی تو ہوتا ہے۔ شاید آپ جسے بہت مقدس جنس سمجھتے ہیں، زارا جیسی ادافروش کے ہاں وہی سب سے آسان سودا ہے۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے سر۔ کسی کے لیے دولت کے انبار، ردی کاغذ کے ٹکڑوں جیسے ہیں، تو کسی کے لیے حُسن اور ادا اس ردی کا نعم البدل۔“ اتنے میں دوسرے ہال سے اسٹیکر پر تقریب شروع ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سارے مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں پہلی ردی میں اپنے نام والی نشست پر بیٹھا تو اچانک میری نظر اسٹیج کے پیچھے اپنے کاموں میں مصروف عدنان پر پڑی۔ میں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا تو کبیر خان مجھے ہال کے دروازے پر جما کھڑا نظر آیا۔ میری اُس سے نظر ملی، تو اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔